مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ

اور ان کے

افکار و خیالات پر ایک نظر

تالیف:

مولانا مسعود عالم ندوی (رحمہ اللہ)

ناشر:

فارغین جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) ۱۴۴۰ھ = ۲۰۱۹ء

نام کتاب : مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ اور ان کے افکار و خیالات
تالیف : مولانا مسعود عالم ندوی (رحمہ اللہ)
کمپوزنگ : عبد القدیر عاصمؔ۔
سنہ اشاعت : 2019
ناشر : فارغین جامعہ (مرکزی دار العلوم)
قیمت : 200/روپئے

ملنے کے پتے

(۱) جامعہ سلفیہ مرکزی دار العلوم بنارس، یو پی۔
(۲) مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن۔ یو پی۔ 09336010224
(۳) ابوالمیزان، بھیونڈی، تھانہ، ممبئی۔ 09521555144
(۴) دار الکتب الاسلامیہ، جامع مسجد دہلی۔ 09910889357
(۵) الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 011-6986973
(۶) **مرشد پبلیکیشن**۔ ابوالفضل، اوکھلا، نئی دہلی۔ 8010026912

فہرست

(۳)

کتاب دوم

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش گفتار

ابتدائے آفرینش سے ہی پیروان حق کو ہمہ قسم کی یورش اور طعنہ زنی کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ مثالب و مطاعن کا شاید ہی کوئی تیر ہو جس کا یہ لوگ ہدف نہ بنے ہوں۔ ان کے مساعی جمیلہ کو مسلکی تعصب اور نظریاتی نزاع کی بنا پر مسخ کرنے اور بگاڑنے کی ناروا کوششیں بھی کی گئیں۔ اور اس تگ و دو میں صداقت و امانت کے دامن کو داغدار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا، مگر اللہ نے حق کے دفاع کے لیے ایسے اعاظم رجال پیدا کیے جنہوں نے احقاق حق اور ابطال باطل کے فریضہ کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ حق کے خلاف اٹھنے والی آواز کا سنجیدگی اور متانت سے علمی و تحقیقی جواب دیا۔

برصغیر کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہوگا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ایک ایسے ماحول میں پروان چڑھے، جہاں ایک طرف ان کو مسلمانوں کے اندر پھیلی ہوئی بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم و رواج کو ختم کر کے انہیں مسلک سلف پر گامزن کرنے کا چیلنج تھا، تو دوسری جانب سیاسی ناحیہ سے ہندوستان پر انگریزی استبداد کے دراز ہوتے سائے کا سامنا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر انہوں نے ایک اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اسلام اور اس کے سیاسی نظام کا نفاذ اور مسلمانوں کے اندر سے بدعات اور شرکیہ رسوم و روایات کی بیخ کنی کرنا تھا۔ گو یہ تحریک سیاسی سطح پر ناکام رہی اور اسلامی حکومت کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن مذہبی واعتقادی اصلاح میں بہ مقصود رسیدہ و بہرہ مند ہوئے اور ملک کی سیاسی ابتری بھی اسے

متزلزل نہ کرسکی۔ اسی فکر ولی اللٰہی کو ان کے جانشینوں نے پوری تندہی اور جانفشانی سے غیر معمولی عروج بخشا اور راہ حق میں جان کا نذرانہ پیش کر کے شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہوئے۔ ''شہیدین'' کے مخلص اور وفا شعار احباب اہل صادق پور نے ان کے اس مشن کو آگے بڑھایا، اور اس راستہ میں اپنے راحت وسکون کو تج دیا اور اپنی جان ومال کو قربان کر دیا، لیکن مسلکی تعصب اور بغض عناد نے فکر ولی اللٰہی کے ان مخلص جانشینوں کی وفا شعاری پر شک کیا اور ان پر دشنام طرازی کی اور ان کے فروعی اختلافات کو وسیلۂ طعن بنایا۔

زیر نظر کتاب، مولانا عبیداللہ سندھی کے ذریعہ ان اکابرین پر کیے گئے اعتراضات کا علمی وتحقیقی جائزہ ہے، جسے مولانا مسعود عالم ندوی جو کہ خاندانی اہل حدیث ہونے کے علاوہ علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے انتہائی محبوب شاگرد تھے، نے لکھی ہے، جن کی تحقیق کا اصل موضوع ہی برصغیر ہند و پاک میں اسلامی دعوت کی تحریک بالخصوص تحریک ولی اللٰہی، تحریک شہیدین اور نجد کی وہابی تحریک تھا۔ ان موضوعات پر جتنا گہرا اور تحقیقی مطالعہ موصوف کا تھا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کے الزامات کا انتہائی عمدگی وہ سنجیدگی سے بے لاگ تحقیقی جائزہ لیا ہے جو پہلی بار ۱۳۶۳ھ میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی خصوصی توجہ نیز مالی اعانت سے پٹنہ سے شائع ہوا اور پھر بعد ازاں مولانا بھوجیانی نے دوبارہ ''دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور'' سے اپنی تقریظ کے ساتھ شائع کیا۔

گزشتہ چند سالوں سے جامعہ سلفیہ سے فارغ ہونے والے طلبہ ہر سال اپنے خصوصی خرچ پر کوئی مفید رسالہ یا کتاب شائع کرتے ہیں جو دین وملت اور مسلک ومنہج کی تفہیم و تشریح پر معاون ثابت ہو۔ اس سلسلہ میں اب تک متعدد رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

چنانچہ اسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے امسال ۱۴۴۰ھ=۲۰۱۹ء کے فارغین اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم ندوی کے رسالہ ''مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے

افکار و خیالات پر ایک نظر'' کی تجدید اشاعت کریں۔ تاکہ علماء و طلبہ کو فکر ولی اللہی، تحریک شہیدین، علماء اہلحدیث بالخصوص علماء صادق پور کی قربانیوں کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

اس موقع پر ہم اللہ رب العالمین کے شکر گزار ہیں جس کی توفیق کے بغیر کسی بھی کام کی انجام دہی ناممکن ہے۔ اور ہم نہایت ہی شاکر و ممنون ہیں اپنے اساتذۂ کرام کے، جنہوں نے ہمیں بولنا اور قلم پکڑنا سکھایا اور علم جیسے گوہر بے بہا سے نوازا تھا۔ تا آنکہ ہم اس لائق ہو سکے کہ اب ہم عملی دنیا میں قدم رکھنے جا رہے ہیں۔ ہم ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ مادر علمی جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) کی شکر گزاری کماحقہٗ ادا کرنے کی ہمارے قلم میں طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شجر کا سایۂ مستطیل ہمیشہ طالبان علوم نبوت کو اپنے دائرۂ ارتقاء میں لیے رہے۔

بعد ازاں ہم احسان مند ہیں فضیلۃ الشیخ عبد الواحد مدنی رحفظہ اللہ کے جنہوں نے اس کتاب کے انتخاب کا مشورہ دیا اور اس سلسلہ میں ہم آپ سے برابر مستفید ہوتے رہے۔ ہم ارمغان تشکر و امتنان پیش کرتے ہیں استاذ الاساتذہ شیخ ابوالقاسم فاروقی رحفظہ اللہ کے حضور جنہوں نے اپنی بے لاگ مصروفیتوں کے باوجود قدم قدم پر ہماری رہنمائی کی اور ہماری درخواست پر نہایت ہی جامع اور نفیس علمی تقدیم پیش کی۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر ہم عبد القدیر سلفی صاحب رحفظہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ وطباعت کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے علاوہ ہم ان تمام حضرات کے سپاس گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں ہماری راہ ہموار کی۔

اللہ کرے ہمارا یہ انتخاب درست ہو اور اس رسالہ کی تجدید اشاعت ملت و جماعت کے حق میں مفید ہو۔ (آمین)

فارغین جامعہ سلفیہ (بنارس)

(2019)

مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے افکار وخیالات پرایک نظر

تعارف وتبصرہ

مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی

(سابق ایڈیٹر ماہنامہ ’’محدث‘‘ بنارس)

مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) کا شمار دیوبند کے نامی گرامی علما میں ہوتا ہے، وہ ضلع گجرات پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، نام بوٹہ سنگھ تھا، سولہ سال کی عمر میں مولانا عبید اللہ پائلی (م ۱۳۱۰ھ) کی کتاب ’’تحفۃ الہند‘‘ اور ’’تقویۃ الایمان‘‘ سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا، اسلامی نام عبیداللہ رکھا گیا، اپنے مرشد کی محبت میں وطنی نسبت پنجابی سے سندھی کردی اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے، دینی تعلیم کے حصول کے لئے دیوبند گئے اور مولانا محمود حسن دیو بندی (م۱۹۲۰ء) کے شاگرد بنے، ۱۹۱۵ء میں افغانستان چلے گئے، یہاں کی الجھی ہوئی سیاست کوقریب سے دیکھا، سات سال کے بعد روس پہنچے، ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں بالشویک تحریک نے زارروس کا خاتمہ کردیا تھا، یہاں کے اشتراکی انقلاب کے سحر نے مولانا سندھی کے دل ودماغ کوجکڑ لیا، کچھ دنوں کے بعدترکی منتقل ہوگئے، یہاں خلافت عثمانیہ کے زوال کی کہانی باسی ہوچکی تھی، مصطفی کمال پاشا جدیدترکی کی تعمیر کررہا تھا، جس کے بنیادی اجزا وطنیت، قومیت اورتجدد تھے، مولانا اس تجدد سے بہت متاثر ہوئے، وہاں سے اٹلی اورسوئٹزرلینڈ کی سیاحت کرتے ہوئے حجاز میں داخل ہوئے، سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حکومت قائم ہو چکی تھی، مکہ شریف میں اقامت گزیں ہوئے، اسلام سے انھیں محبت تھی، سیاست کا شوق فطری تھا، حرم شریف میں

سکون کے ساتھ انھوں نے اسلام کے سیاسی نظام کا ایک ایسا خاکہ بنایا، جس کے اہم اجزا یوروپ کے جدید نظریات تھے، اسے لے کر وہ ۱۹۳۹ء میں وارد ہندوستان ہوئے۔

مولانا سندھی نے پہلی جنگ عظیم کے ایک سال بعد ہندوستان چھوڑا اور واپس لوٹے تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا، اس عرصہ میں ہندوستان کے سیاسی حالات یکسر بدل چکے تھے، انگریزوں کا عہد استبداد آخری سانسیں لے رہا تھا، تحریک آزادی کی جنگ شباب پر تھی، ان تغیرات میں مولانا سندھی کی کوئی حصہ داری نہیں تھی، نئی نسلوں کے لیے وہ اجنبی تھے اور ان کی حیثیت ڈوبتے تارے کی مانند تھی، لیکن علمی تقدس اور مذہبی اعتبار سے دیوبندی مکتب فکر میں وہ اب بھی بڑے محترم تھے۔

مولانا سندھی کی فکر ونظر میں تبدیلیوں کے آثار ۱۹۱۲ء کے بعد ہی نمودار ہونے لگے تھے، لیکن یوروپ وحجاز سے واپسی کے بعد وہ بالکل بدل چکے تھے، اپنے نظریات کا اعلانیہ اظہار انھوں نے ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد کیا، ۱۹۴۰ء میں ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے ایک مضمون ''امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف'' لکھ کر بھیجا، مضمون کے طریق ابلاغ میں اس قدر اغلاق اور تعقید تھی کہ مولانا منظور احمد نعمانی کو باقاعدہ ادارتی نوٹ لگانا پڑا کہ قارئین غور اور تعمق کے ساتھ اسے ملاحظہ کریں، میں نے بعض مقامات پر چند بار اور غور سے مطالعہ کیا تو مراد کو پا سکا۔

۱۹۴۱ء میں مولانا سندھی نے ایک اور مقالہ ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' کے نام سے لکھا، ان کی یہ کتاب بھی ژولیدہ بیانی کا نمونہ تھی، اسے قابل فہم بنانے کے لیے ان کے شاگرد مولانا نور الحق علوی پروفیسر اورینٹیل کالج لاہور نے کتاب کے دوسرے حصے میں حواشی مرتب کیے، اسی کتاب میں مولانا سندھی نے اپنے خیالات اور تصورات کو ایک نئے اسلامی نظام کی حیثیت سے متعارف کرایا، جس میں ایک طرف آپ نے تفسیر بالرائے، وطنیت، قومیت، اشتراکیت، انقلاب، وحدت ادیان، قادیانیت کے لیے نرم

گوشے،تشریعی احکام کی زمانیت، عقائد(مثلاً نزول عیسیٰ ، عذاب فاسقین ، کفار کا خلود فی النار وغیرہ) کے بارے میں برملاان افکارکوپیش کیاجو براہ راست قرآن وسنت سے متصادم اورامت کے اجماعی تعامل کے منافی تھے، دوسری طرف وہ اپنی تمام تر روشن خیالیوں کے باوجوداپنے اکابر کی تقلیدی عصبیت کی روش پر قائم تھے، آپ نے اہل حدیثوں کی دل آزاری کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا،تحریک شہیدین کی سیاسی ناکامی کا سبب علمائے اہلحدیث خصوصاعلمائے صادق پورکو بتایا، مولانا عبدالحق محدث بنارسی، امام شوکانی اورشیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کومورد طعن بنایا، ان بے چاروں پر بہتانات تراشے، اپنے نظریات کے ڈانڈے حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملائے اوران کی فکرکواپنے اصولوں کی اساس قرار دیا، اسلامی مسائل اورآیات قرآنیہ کی بعید از قیاس اورمن مانی توجیہات کیں تاکہ اپنے فلسفہ کوشاہ صاحب کی فکر سے ہم آہنگ کرسکیں،حزب ولی اللہی کی تشکیل کے لیے تاریخ کواپنے موقف کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، اس کے لیے تاریخ سازی بھی کرنا پڑی تواس سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اسی دوران مولانا سندھی کے تربیت یافتہ پروفیسرمحمدسرورجامعہ ملیہ دہلی (م ۱۹۸۳ء) کی کتاب ’’مولانا عبیداللہ سندھی کے افکاروخیالات‘‘ شائع ہوئی، اس سلسلے کی کتابوں کی اشاعت سے برصغیر کے علما میں تشویش اوراضطراب کی لہر دوڑگئی،جس کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے، مولانا ابوالاعلی مودودی پروفیسرمحمدسرور کی کتاب’’مولانا عبیداللہ سندھی: حالات، تعلیمات اورسیاسی افکار‘‘ پرتبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقے سے تھا، جواپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حدکمال پر پہنچا ہواہے، یہی وجہ کہ مولانا یہ سب کچھ فرماگئے اورلکھوا اورچھپوا بھی گئے اورپھربھی تنقید کی زبانیں بند اورتعریف کی زبانیں تر رہیں، ورنہ اگرانھوں نے اس طبقہ خاص سے باہرجگہ پائی ہوتی توان کا استقبال سرسیداور

علامہ مشرقی سے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔‘‘

(’’ترجمان القرآن‘‘، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۴۴ء)

علامہ سید سلیمان ندوی مولانا مسعود عالم ندوی کے نام اپنے ایک طویل مکتوب میں رقم طراز ہیں:

’’آپ نے سچ کہا، مولانا شبلی کی پیش گوئی کہ آخر دیو بندبھی کب تک دیو بندرہے گا، برہان والوں کے مضامین نے اسی کا ثبوت بہم پہنچایا، حضرت شاہ صاحب کے ان ہی خیالات کی اس تشریح کو اگر سرسید اور شبلی کا قلم بیان کرے تو بے دینی، اور اگر فضلائے دیو بند لکھیں تو عین دین، بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔‘‘

(مکاتیب سید سلیمان ندوی، مرتب، مسعود عالم ندوی، مکتوب نمبر ۱۸۳، صفحہ ۱۸۷)

یہ حقیقت ہے کہ اکابر پرستی کی بیماری خود احتسابی اور تنقید سے دوری پیدا کردیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سمجھنے کے باوجود کہ مولانا سندھی کی راہ غلط ہے، اس مکتب فکر کے بیش تر علما اس قضیے سے دور رہے، پھر بھی ان دونوں بزرگوں کے بیانات سے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اگر ایک طرف مولانا سید محمد میاں دہلوی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی ان کا دفاع کرتے رہے تو دوسری طرف مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مفتی محمد تقی عثمانی نے ان کی فکر پر سخت تنقیدیں کیں۔

اللہ کے فضل سے مولانا سندھی کے افکار پر سب سے پہلے نقد کرنے کی توفیق اس نے ایک صاحب بصیرت اہل حدیث عالم کو بخشی، مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا سندھی کی حیات میں ہی ماہنامہ ’’معارف‘‘ فروری، مئی ۱۹۴۳ء میں سنجیدہ اور علمی متانت سے بھرپور جواب لکھا، نیز معارف ۱۹۴۴ء کے شماروں میں پروفیسر محمد سرور کا ناقدانہ جائزہ لیا، مولانا عطاء اللہ بھوجیانی کی تحریک اور تعاون سے مولانا ندوی نے دونوں مقالوں کو یکجا کرکے خود

اپنی نگرانی میں ۱۹۴۴ء میں مکتبہ دین ودانش، بانکی پور، پٹنہ سے شائع کیا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کے لیے وقیع اور مبسوط مقدمہ لکھا، جس میں آپ نے مولانا سندھی کی بوالعجبیوں کو واضح کیا، دوسری بار بھی مولانا بھوجیانی کے ایما اور فرمائش پر یہ کتاب ''دار الدعوۃ السّلفیہ''، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں آفسٹ پر شائع ہوئی۔

۱۹۴۴ء میں مولانا سندھی کا انتقال ہوگیا، لیکن ان کی فکر کے زہریلے اثرات باقی رہے، ان کے عقیدت منداور فیض یافتہ لوگوں نے ان کی زندگی میں ساگر اکیڈمی سندھ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے ذریعہ ان کے افکار اور تعلیمات پر مشتمل لٹریچر کو پورے برصغیر میں مشتہر کیا گیا، مولانا مسعود عالم ندوی کے جواب میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنے مجلہ ''برہان'' (ندوۃ المصنفین، دہلی) میں مقالے تحریر کیے جو بعد میں ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ مولانا سندھی نے حزب ولی اللہی کا جو فرضی سلسلہ شاہ ولی اللہ سے مولانا محمود حسن تک بنایا تھا، اسے آج بھی خالص سیاسی پارٹیوں کے اصولوں کے مطابق پیش کیا جا رہا ہے، ۱۹۸۷ء میں مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نے ملتان میں ''تنظیم فکر ولی اللہی'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی، جس کا مقصد مولانا سندھی کے افکار کو زندہ رکھنا ہے، اس کے ممبران مولانا سندھی کو امام انقلاب کہتے ہیں، اور ان کی شاذ اور غیر معتدل فکر کو شاہ صاحب کی فکر قرار دیتے ہیں، پاکستان کے ''وفاق المدارس العربیہ بورڈ'' نے اس تنظیم کے طرز عمل اور افکار و نظریات کے پیش نظر اسے ۲۰۰۰ء میں بورڈ سے خارج کر دیا، سنجیدہ فکر کے علما آج بھی اس قسم کے افکار کی اصلاح اور اس کی ہلاکت خیزیوں سے باخبر کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں، چنانچہ ۲۰۱۴ء میں مفتی محمد رضوان نے ''مولانا عبید اللہ سندھی کے افکار اور تنظیم فکر ولی اللہی کے نظریات کا تحقیقی جائزہ'' کے نام سے پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک جامع کتاب ترتیب دی، جس میں ہندو پاک کے اصحاب علم وقلم کے ناقدانہ مقالات، تبصروں، آرا اور

مولانا سندھی کی طرف منسوب غیر متوازن اور شاذ افکار کی تنقیدات اور فتاووں کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کتاب میں مولانا مسعود عالم ندوی کے دونوں مقالے بھی شامل ہیں، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں ادارہ غفران راولپنڈی سے شائع ہوا، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں مذکورہ ادارے سے اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے فضیلت سال آخر کے طلبا نے امسال اشاعت کے لئے مولانا مسعود عالم ندوی کی معرکہ آرا کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' کو منتخب کیا ہے، اس کتاب کی افادیت اور اہمیت آج بھی مسلم ہے، اسلام کی نظریاتی تعبیر وتشریح اور تفسیر بالرائے کی جو روش عام چل پڑی ہے، اس فتنہ کے سد باب میں مذکورہ کتاب کی اشاعت اہم کردار ادا کرسکتی ہے، میں اپنے عزیز طلبا کو اس موقع پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، ان کی بیکراں محبت اور بے پایاں خلوص کا ممنون ومشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے ابھی تک یاد رکھا، اللہ سے دعا ہے کہ عملی میدان میں انھیں کامیابیوں سے ہم کنار کرے اور فکری یلغار کا مقابلہ کرنے کی قوت اور صلاحیت بخشے۔ آمین۔

والسلام

محمد ابوالقاسم فاروقی

۱۵/ مارچ ۲۰۱۹ء بروز جمعہ

حافظ صلاح الدین یوسف

مولف کتاب مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ

مختصر سوانح اور خدمات

مولانا مسعود عالم ندوی کی پیدائش ۲۱ رمحرم ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۱ رفروری ۱۹۱۰ء کو صوبہ بہار کے ایک گاؤں ''اوگانواں'' میں ہوئی۔ یہ گاؤں ضلع پٹنہ کے ایک قصبے بہار شریف میں واقع ہے۔ اسی کے قریب ان کے استاد مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا وطن دیسنہ بھی واقع ہے۔

ان کے والد مولانا حکیم سید ابوالفتح عبدالشکور کا شمار صوبہ بہار کے چند بلند پایہ علماء میں سے ہوتا تھا۔ تدریس کے ساتھ حکمت کا شغل بھی تھا۔ آپ کے دادا مولانا سید خدا بخش صاحب بھی اپنے وقت کے اچھے عالم اور اہل حدیث تھے۔ آپ کا ننھیال بھی اہل حدیث اور مشہور اہل حدیث عالم مولانا حافظ عبداللہ رحمہ اللہ غازی پوری کا شاگرد تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی معروف معنوں میں گو اہل حدیث کہلانے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم سلفیت میں نہایت پختہ تھے۔

ابتدائی عربی تعلیم والد ماجد سے اور مدرسہ ''عزیزیہ'' پٹنہ میں حاصل کی، پٹنے میں ہی نویں جماعت تک اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر عربی ادب کا شوق انہیں ''ندوۃ العلماء'' لکھنؤ لے گیا۔ جس کی طرف مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے رہنمائی فرمائی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں ندوہ کے آخری سال میں داخلہ لیا اور نہایت ممتاز حیثیت میں وہاں کے سالانہ امتحان میں کامیابی حاصل کی اور مزید دو سال ندوہ میں قیام کر کے ''تاثیر الإسلام فی الشعر العربی'' کے

عنوان پر مقالہ تیار کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

فراغت کے بعد پھر اپنے وطن (بہار) واپس آ گئے اور انگریزی پڑھنے میں مصروف ہو گئے کہ انہی ایام میں حجاز سے ادیب شہیر ممتاز اہل حدیث عالم شیخ تقی الدین الہلالی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بطور استاد عربی ادب تشریف لے آئے۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب کو چونکہ عربی ادب وانشاء کا خاص ذوق تھا، اس لیے وہ دوبارہ ندوہ میں آ گئے اور ہلالی صاحب سے خوب کسب فیض کیا اور اپنی آخری زندگی تک ان سے علمی استفادہ جاری رکھا۔

۱۹۳۲ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی ماہنامہ کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ اس کی ادارات کے لیے مولانا مسعود عالم صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ وہی عربی پرچہ ہے جو ''الضیاء'' کے نام سے مشہور ہے اور جو ہندوستان کا پہلا عربی پرچہ تھا۔ یہ اگرچہ کل چار سال جاری رہا۔ لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کے لحاظ سے عربی ممالک کے علمی وادبی حلقوں میں نہایت وقیع نظروں سے دیکھا گیا۔ اور اس کی وجہ سے مسعود صاحب کا عالم عرب میں بھی خاصا تعارف ہو گیا۔

۱۹۳۷ء میں کچھ عرصہ اخبار ''مدینہ'' بجنور میں بھی کام کیا اور پھر اسی سال آپ کا پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں بطور کیٹلاگر (مرتب فہرست) تقرر ہو گیا۔ تقریباً سات سال دسمبر ۱۹۳۷ء تا اکتوبر ۱۹۴۴ء آپ لائبریری سے وابستہ رہے۔ قیام پٹنہ کے دوران ہی میں اپنی محققانہ تالیف محمد بن عبد الوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح۔ مرتب کی۔

دار العلوم ندوہ کے قیام ہی کے زمانے میں ''ترجمان القرآن'' کے مطالعے کی وجہ سے مولانا مودودی صاحب کے بھی عقیدت مند اور مداح تھے۔ چنانچہ جب اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی تو مولانا مسعود صاحب بھی اس کے رکن بن گئے اور صوبہ بہار کی جماعت اسلامی کے امیر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں مولانا مودودی صاحب کی خواہش پر پٹنہ سے پنجاب (پٹھان کوٹ، مرکز جماعت اسلامی) منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب کا خیال تھا کہ ایک عربی ماہنامے کا اجراء

کیا جائے اوراپنی تالیفات کوعربی کا جامہ بھی پہنایا جائے۔مولانا مسعود صاحب کوانہی دوکاموں کی غرض سے پٹھان کوٹ بلوایا گیا تھا۔لیکن مولانا مسعود صاحب کو پٹھان کوٹ (مشرقی پنجاب) کی آب وہوا راس نہ آئی۔بالآخر منصوبے کے لیے جالندھر کا انتخاب ہوا۔اوروہاں مذکورہ مقاصد کے لیے "دار العروبة للدعوة الإسلامی" کا قیام عمل میں آیا۔۱۹۴۷ء تک مولانا مسعود صاحب کا قیام یہیں رہا۔عربی پرچے کا اجراء تونہیں ہوسکا، تاہم ان کی نگرانی میں بعض کتابوں کو عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔اورخود انھوں نے اسلامی تحریک کی تاریخ عربی میں ''غربة الإسلام فی الهند'' کے نام سے لکھنی شروع کی۔

قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کے ساتھ مولانا مسعود عالم بھی لاہور تشریف لے آئے اورراولپنڈی میں "دار العروبة" کے قیام کا فیصلہ ہوا۔یہاں مولانا مسعود عالم نے مولانا مودودی کے بعض رسائل کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۱۹۴۹ء میں بعض عرب ممالک کا دورہ کیا اور وہاں پہلی مرتبہ ان کے ذریعے سے مولانا مودودی کی شخصیت اوران کی دینی خدمات کا تعارف ہوا۔اس سفر کی روداد مولانا رحمہ اللہ نے ''دیارعرب میں چندماہ'' کے نام سے مرتب کی، جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی کے بعض رفقاء سمیت گرفتار ہوئے اور چار مہینے سے زیادہ پس دیوارزنداں رہ کر سنت یوسفی بھی ادا کی۔

۲۰-۲۲ سال سے مرض تنفس میں مبتلا تھے۔جب کبھی مرض کا حملہ ہوتا تو تکلیف بہت زیادہ بڑھ جاتی، تاہم مرض میں افاقے کے بعد اپنے علمی ودعوتی منصوبوں میں مصروف ہوجاتے۔زندگی کا کارواں اسی طرح صورت خورشید (کبھی ڈوبتا کبھی نکلتا) رواں دواں رہا تا آنکہ ۱۶/مارچ ۱۹۵۴ء کوکراچی میں مرض کا ایک سخت دورہ پڑا اوراس کے تھوڑی دیر بعد ہی جان جاں آفریں کے سپرد کردی، اوراب کراچی میں ہی آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

غفر اللہ لہ ورحمه

تصنیفات:

مولانا رحمہ اللہ نے اپنے پیچھے چند یادگار تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف (عربی میں) وہ ہے جس کا ذکر "غربة الإسلام" کے عنوان سے پہلے آ چکا ہے لیکن بعد میں اس کا نام انہوں نے "تاریخ الدعوة الإسلامية فی الهند و باكستان" رکھ دیا تھا۔ مگر افسوس یہ کتاب ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ البتہ اس کا خلاصہ "نظرة اجمالية فی التاریخ الدعوة الإسلامية" کے نام سے طبع ہوا تھا۔ اب وہ بھی نایاب ہے۔

۲۔ ''محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح''۔

۳۔ اسلام اور اشتراکیت۔ ۴۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔

۵۔ دیار عرب میں چند ماہ (سفرنامہ) ۶۔ الترجمة العربية۔

۷۔ مولانا مودودی کے رسائل ''دین حق''، ''اسلام اور جاہلیت''، ''شہادت حق'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا عربی ترجمہ۔

۸۔ محاسن سجاد۔ مولانا محمد سجاد بہاری (مشہور خلافتی لیڈر) کی زندگی اور شخصیت پر مضامین کا مجموعہ، جسے مولانا نے مرتب کر کے شائع کیا تھا، جس میں ان کے قلم سے بھی ایک دردناک مضمون شامل ہے۔

۹۔ ''مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر'' یہی وہ کتاب ہے، جو اب ''صادقین صادق پور اور علمائے اہل حدیث مولانا عبید اللہ حنفی کے الزامات کا جائزہ'' کے عنوان سے قارائین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۰۔ ''مولانا عبید اللہ سندھی پر ایک ناقدانہ جائزہ'' جو پروفیسر محمد سرور (جامعی) رحمہ اللہ (متوفی ستمبر ۱۹۸۳ء) کی لکھی ہوئی کتاب پر نقد و تبصرہ ہے اور زیر نظر کتاب کے ساتھ مطبوع ہے۔

ان مستقل تالیفات کے علاوہ مولانا کے عربی اردو رسائل میں متعدد مضامین چھپے ہوئے ہیں جو ابھی تک مرتب نہیں کیے جا سکے۔

(ماخذ ماہنامہ ''چراغ راہ'' کراچی، مولانا مسعود عالم ندوی نمبر مطبوعہ مارچ ۱۹۵۵ء۔)

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (رحمہ اللہ)

مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ

آہ! کیسی یاد تازہ ہوئی۔ غالباً ۱۹۴۴ء کا لگ بھگ ہوگا کہ مشہور دیو بندی عالم و مفکر مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی کتاب ''شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک'' لاہور سے شائع ہوئی تھی جس میں شاہ ولی اللہ کے فکر کو اپنے مخصوص سیاسی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ شہیدین رحمہا اللہ کی تحریک جہاد کے سلسلے میں تاریخ نویسی کے بجائے ''تاریخ سازی'' سے کام لیا گیا تھا۔ خصوصاً مولانا محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ، صادقین صادق پور رحمہم اللہ، بعض اعاظم علماء اہل حدیث ہند رحمہم اللہ اور امام شوکانی رحمہ اللہ وغیرہم کے بارے میں عجیب وغریب مغالطے پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

اس کتاب کے مستشرقانہ قسم کے مندرجات پر ایک ندوی فاضل کے قلم سے مجلہ ''معارف'' اعظم گڑھ (ہند) کے چند شماروں میں بھر پور علمی اور تحقیقی تنقید شائع ہوئی۔ جسے حلقہ علماء حق میں بہت پسند کیا گیا اور یہ فاضل ندوی مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو ان دنوں عظیم آباد پٹنہ (ہند) کی مشہور ''خدا بخش لائبریری'' میں فہرست مرتب کرنے کی غرض سے مقیم تھے۔

اسی اثناء میں ''مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار وتعلیمات'' کے عنوان سے ایک دوسری

ایسی کتاب طبع ہوگئی جو دینی لحاظ سے انتشار فکری کا شاہکار تھی۔ اس کا بھی مولانا رحمہ اللہ ہی نے غیرت دینی سے بے قرار ہو کر ''ناقدانہ جائزہ'' لے ڈالا جو ''معارف'' ہی (غالباً ۱۹۴۴ء کے آخری کسی مہینے) میں اشاعت پذیر ہوا۔

راقم السطور ان دنوں فیروز پور شہر (مشرقی پنجاب) میں تھا۔ ارادہ ہوا کہ ''معارف'' کے ان بلند پایہ مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی افادیت کو عمومیت و پایندگی حاصل ہو جائے۔ گو سابق تعارف نہ تھا۔ تاہم خط و کتابت کی گئی۔ موصوف نے نفس تجویز سے اتفاق کیا۔ لیکن طے یہ پایا کہ کتاب مولف کی زیر نگرانی پٹنہ میں طبع ہو جس کے اخراجات ہماری طرف سے پٹنہ روانہ کر دیئے جائیں۔ چنانچہ رقم بھیج دی گئی اور چند ماہ کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ''مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر'' نام سے ۱۶۴ صفحات (کتابی سائز) پر مشتمل ایک کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئی۔ وللہ الحمد۔ جس پر ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ تاریخ مندرج ہے۔ کتاب میں وہ خط و کتابت بھی شامل کر دی گئی جو اس دوران صاحب مقالات اور مولانا سندھی کے درمیان ہو چکی تھی۔

اب ہمارے تعلقات میں مزید استواری پیدا ہوگئی۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ مستقل قیام کے لیے پنجاب آنا چاہتے ہیں۔ ادھر سے بکمال خوشی آمادگی ظاہر کر دی گئی۔ چنانچہ (غالباً ۱۹۴۵ء میں) فیروز پور شہر آ گئے اور کم وبیش چھ ماہ میرے ہاں ان کا قیام رہا لیکن چونکہ دمہ کے دائمی مریض تھے۔ فیروز پور شہر کی آب و ہوا راس نہ آئی اور اس اثناء میں جماعت اسلامی سے بھی گہرا رابطہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے خوب سوچ بچار کے بعد جالندھر (مشرقی پنجاب) میں انہوں نے اپنی رہائش منتقل کر لی اور قیام پاکستان کے بعد چند مقامات کا تجربہ کر کے راولپنڈی ٹھہر گئے اور ''دار العروبہ'' نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا تا آنکہ مارچ ۱۹۵۴ء (رجب ۱۳۷۳ھ) عین جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے

ہو گئے۔إنا لله وإنا اليه راجعون، غفر الله له وجعل الجنة مثواه۔

مولانا مسعود عالم کے ذاتی حالات کا راقم کو اسی قدر علم ہے کہ آپ کے ماموں مولانا سید عبدالکبیر صاحب رحمہ اللہ بڑے جید اہل حدیث عالم تھے۔ جو مولانا محمد سعید بنارسی رحمہ اللہ (م ۱۳۲۲ھ) کے تلمیذ رشید، ان کے دارالحدیث کے معلم اور ان کے اشاعتی کاموں میں مددگار ومعاون تھے۔ مولانا مسعود عالم کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ بھی مسلک اہل حدیث میں نہایت پختہ تھیں۔ پھر ندوہ میں ان کو شیخ تقی الدین ہلالی المراقشی استاذ مل گئے جو اعتقاداً وعملاً پختہ اہل حدیث ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا مسعود عالم بنیادی طور پر اہل حدیث تھے۔ اگرچہ اسی دور (۱۹۴۰-۱۹۴۷ء) کے ملکی حالات کے نتیجے میں ''تحریک اسلامی کے سیاسی نظریات'' اور فکر وعمل میں ان پر ''ندویت'' غالب تھی۔ چنانچہ ایسے معاملات میں تو ہم دونوں کی راہیں مختلف رہیں مگر اس اختلاف منہاج کا ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اول سے آخر تک یکساں رہے اور اسی قدر نہیں بلکہ ادارہ ''الاعتصام'' سے بھی تاحین حیات ان کا نہایت مخلصانہ رابطہ برابر قائم رہا۔ مولانا مسعود عالم کی تحریری یادگاروں میں ہمارے نزدیک اعلیٰ درجہ کی ان کی تالیف ''محمد بن عبدالوہاب ایک بدنام اور مظلوم مصلح'' کتاب ہے جو جامعیت اور اخلاص میں تاحال منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

(منقول از ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

(از مصنف رحمہ اللہ)

زیر نظر کتاب میں راقم کے دو مضمون شائع ہو رہے ہیں، جو اس نے مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ وغفرلہ کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک'' اور پروفیسر محمد سرور کی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اوران کے افکار وتعلیمات'' پر تنقید اور استدراک کے طور پر لکھے تھے، پہلا مقالہ مولانا کی زندگی میں شائع ہوا۔ (معارف، فروری، مئی ۱۹۴۳ء) اور ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ناقد کو مسلسل پانچ خط بھی لکھے، جس میں انہوں نے اپنے افکار کی مزید توضیح کی تھی۔ وہ ''خطوط'' بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ مولانا کے افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو، نیز اسی ''استدراک'' کے سلسلے میں مولانا نے بستر علالت سے (وفات سے تقریباً دو ہفتے پیشتر) ابھی ایک خط اپنے پرائیویٹ سکریٹری (پرسنل اسسٹنٹ) سے لکھوا کر بھیجوایا تھا، وہ بھی ان ''خطوط'' کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے، ان خطوط کے علاوہ مولانا نے ''برہان'' دہلی (مئی ۱۹۴۳ء) میں بھی اپنے افکار کی مزید تشریح اور ''استدراک'' کے بعض شبہات کی تصحیح کی تھی۔ برہان کے اس مضمون اوران کے تمام خطوط میں تقریباً ایک ہی خیال کا اعادہ کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون جون ۱۹۴۴ء میں لکھ کر معارف کو بھیجا جا چکا تھا، مگر اتفاق یہ کہ وہ جولائی یا اگست میں نہ چھپ سکا، اور اسی دوران میں مولانا سندھی کے سانحہ ارتحال کی خبر ملی۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔ خبر

سنتے ہی دل بیٹھ گیا، اور افکار وعقائد کے انتہائی اختلاف کے باوجود یہ صدمہ صبر آزما ثابت ہوا۔

—اللہ ان کا مقام بلند کرے اور انکی خدمات کے عوض، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے—ایسے بالغ نظر، انتھک کام کرنے والے اور وسیع القلب انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' پر استدراک کے چھپتے ہی کتابی صورت میں اس کی اشاعت کا تقاضا شروع ہوگیا تھا، مگر کاغذ کی کمیابی، اور دوسری مشکلات کے باعث یہ تقاضہ اب سے پہلے عملی جامہ نہ پہن سکا۔ خیال تھا کہ اشاعت کے وقت بعض مضامین کا اضافہ ہوسکے گا۔ نیز ''برہان'' میں مولانا کی بعض جدید توضیحوں کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جاسکے گا، مگر اب کہ مولانا ہمارے درمیان میں نہیں ہیں، دل ودماغ مزید کاوش کے لیے تیار نہیں، یہ مقالے بھی احساس فرض سے مجبور ہوکر شائع کیے جارہے ہیں۔ اور حاشا وکلّا!! ان سے مولانا کی تردید نہیں بلکہ ان کے افکار وخیالات کی تنقید وتنقیح مقصود ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ ہم مولانا کے ''نئے افکار'' سے متفق نہیں، اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ ان کے ''جدید نظریئے'' کتاب وسنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، اس لیے ہم ان نظریوں کی تنقید وتنقیح پر مجبور ہیں، خواہ اس میں جذباتِ محبت وعقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو؟ کہ حق کی تائید تعلقات ومحبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔

فالحق اولٰی من ولیك حرمة
و احق منك بنصرة وكفاح

(شوقي)

کاغذ کی نایابی اور ہوش ربا گرانی کے اس دور میں شاید یہ کتاب شائع نہ ہو سکتی، اگر محب محترم مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف، (فیروز پور) کا پیہم اصرار نہ ہوتا، اور برادر عزیز مولوی تقی الدین صاحب نعمانی (مینیجر مکتبہ دین و دانش، بانکی پور، پٹنہ) کی مستعدی دوسرے مشکلات کے حل کی کفیل نہ ہو جاتی اور ان کے ساتھ برادر عزیز سید محی الدین صاحب اصلاحی ندوی (مالک برقی پریس پٹنہ کاغذ کی فراہمی کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے لیتے — اللہ ان صاحبوں کو اجر دے کہ محض لوجہ اللہ، انھوں نے یہ تکلیف برداشت کی، اور ایک دینی و علمی خدمت کی انجام دہی میں ایک نحیف و ناتواں بندے کا ہاتھ بٹایا۔

آخر میں استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی (متعنا اللہ بطول بقائہ) کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے خادم کی درخواست پر ایک بے لاگ اور دلنشیں مقدمہ تحریر فرما کر کتاب کی عزت بڑھائی اور ناظرین کتاب کے لیے بصیرت اور روشنی کا سامان فراہم کیا۔ **فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔**

عاجز: مسعود عالم ندوی

(مہندرو، پٹنہ، ۲۵/ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ)

''معارف'' کا ادارتی نوٹ

از: مولانا سید سلیمان ندوی

ذیل کا مختصر نوٹ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کا اس وقت کا رقم فرمودہ ہے جب مولانا مسعود عالم ندوی کی یہ کتاب بصورت مضمون پہلی مرتبہ (۱۹۴۳ء میں) ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں جب یہ مضمون کتاب کی شکل میں شائع ہوا تو اس ''معارف'' کے نوٹ کو اس میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ سید صاحب موصوف کا ایک مستقل مقدمہ زینت کتاب ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے اب مقدمے کے ساتھ ساتھ سید صاحب رحمہ اللہ کی یہ فاضلانہ ابتدائی تحریر بھی شامل کتاب کر لی گئی ہے۔

(ناشر سابقہ ایڈیشن، دارالدعوۃ السّلفیہ، لاہور)

مضمون ذیل میں ایک عزیز نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' متن مع شرح پر ایک تبصرہ لکھا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا موصوف حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل پر بہت عمیق نظر رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے متفرق مسائل کو انہوں نے اپنے خیالات اور نظریوں کے مطابق اس طرح منظم کر لیا ہے کہ گویا شاہ صاحب کا مخصوص فلسفہ تیار ہو گیا ہے۔ یہ بحث دوسری ہے کہ شاہ صاحب کے ایک فقرے سے کہیں پورا باب اور کہیں شاہ صاحب کے پورے باب سے صرف ایک فقرہ لے لیا گیا ہے، اور اس طرح حسب خواہش فلسفہ تیار ہو گیا ہے۔

بہر حال مولانا اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پورے فلسفے کو جس کو انھوں نے اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ کاغذ کے صفحوں میں ترتیب دے دیں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ اس سے ایک فائدہ جہاں یہ پہنچے گا کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم منظم ہو کر ناظرین کے سامنے آجائیں گے۔ وہاں یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ خود مولانا سندھی اور ان کے پورے مدعا کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی ورنہ پوری داستان کا یوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھیلنا بات کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا اور مقاصد کا منتشر کر دینا ہے۔

معارف میں اس کتاب پر جو مختصر تبصرہ شائع ہوا تھا، اس کتاب کے جواب میں مولانا سندھی رحمہ اللہ کا مکرمت نامہ آیا ہے، اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ موصوف کے خیالات جو لوگ شائع کر رہے ہیں وہ اَدھ کٹی صورت میں ہیں اور اس طریق اشاعت سے بہت سے گوشے ناتمام رہ جاتے ہیں اور مصنف بہت سے جھوٹے سچے الزامات کا نشانہ بن جاتا ہے۔

مولانا سندھی کے نزدیک سید شہید رحمہ اللہ کی تحریک کی ناکامی کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شوکانیت اور وہابیت یا صریح لفظ کہیے کہ غیر مقلدیت کی آمیزش ہوگئی تھی، اور غالباً اس موجودہ ردوقدح کا مرکز بھی یہی خیال ہے۔ مگر جہاں تک خاکسار کے علم کا تعلق ہے اس تحریک کے علم برداروں میں فقہی جنگ وجدال یا آمین اور رفع یدین کے ذریعے رد بدعت یا اتباع سنت کا خیال کبھی راہ نہیں پایا، سید شہید رحمہ اللہ، مولانا شہید رحمہ اللہ اور دوسرے وابستگان دامن کی تحریر وتقریر ومناظرہ اور خطوط ومکاتیب وغیرہ موجود ہیں، ان سے استناد کرنا چاہئے، تحریک کا مقصود عقائد کی صحیح اصلاح، اعمال کی اصلاح، توحید کی اشاعت، باطل کا رد اور رسوم فاسدہ کا ازالہ اور احکام اسلامی کا اجراء تھا۔ باقی حکایات و روایات آحاد اس باب میں سند کے قابل نہیں، خواہ کسی جانب سے ہوں، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس تحریک نے اتباع سنت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس کے اثر سے کچھ لوگوں کو وہ

کتب احادیث کے دفتر میں جو چیز اول وہلہ میں سنت ثابت ہوتی نظر آئی ہے، اس کے قبول کر لینے میں کوئی تقلیدی خیال ان کو باز نہ رکھ سکا۔ سرسید کے ایک خط سے، جو مولانا ابراہیم صاحب آروی رحمہ اللہ شاگرد رشید مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے نام ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نذیر حسین صاحب نے آمین بالجہر اور رفع یدین پر عمل سرسید کی حوصلہ افزائی سے شروع کیا۔

مولانا ابوالکلام کے والد ماجد جو اس تحریک کے شدید مخالفین میں تھے، اس کو بنی اسرائیل کی طرح دو سلسلوں میں منقسم کرتے تھے۔ اسماعیلی اور اسحاقی اور دونوں کو برسر باطل کہتے تھے، اسماعیلی سے ان کا مقصود مولانا شاہ اسماعیل شہید کے متبع، یعنی حضرات اہل حدیث اور اسحاقی سے مولانا شاہ اسحاق صاحب دہلوی رحمہ اللہ کے پیروکار یعنی حضرات دیوبند تھے۔ آج کل ظرافت سے، پہلے کو لال وہابی اور دوسرے کو گلابی وہابی کہا جاتا ہے۔ مگر بہرحال مخالفین کی نظر میں ہیں دونوں وہابی، مگر یہ گلاب ان دنوں کلی تھا، پنکھڑیاں آج کی طرح الگ الگ نہیں تھیں۔

ان دونوں کے درمیان درحقیقت عقائد کا چنداں فرق نہیں، فرق ہے تو اس کا کہ ایک فقہ میں غیر مقلد ہے اور دوسرا فقہ میں مقلد۔

مولانا سندھی گو بہت سے خیالات میں آزاد ہیں۔ مگر مقلدیت کے باب میں ان کا تشدد علیٰ حالہ قائم ہے۔ اس کا اثر ان کی ہر تحریر میں نظر آتا ہے۔ موجودہ مناقشہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے اور قاضی شوکانی اور محمد بن عبدالوہاب وغیرہ پر ان کے اشارے اسی نوعیت کے ہیں۔ بہرحال میری یہ تمہید کوئی محاکمہ نہیں بلکہ فریقین کو ایک دوسرے کے زاویۂ نظر کے سمجھانے میں سہولت بہم پہنچانا ہے۔

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ ہند جلد ۵۱ شمارہ: ۲)

(فروری ۱۹۴۳ء)

مقدمہ

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (مدظلہ)(۱)

یورپ کے مادی عروج اور مسلمانوں کے مادی تنزل نے ایک زمانے سے مسلمان مفکرین کو مضطر اور بے چین بنا رکھا ہے، مسلمان مفکرین میں سے سید جمال الدین افغانی نے اس کا علاج اتحاد اسلامی تجویز کیا، اور یہ دعوت دی کہ تمام مسلمان حکومتیں اور قومیں باہم متحد ہو کر یورپ کا مقابلہ کریں۔ اسی اتحاد اسلامی کا نام پین اسلامزم ہے، رحمہ اللہ نے اپنے اس مجوزہ پروگرام کی خاطر گھر بار چھوڑ کر ہندوستان، ایران، مصر اور ٹرکی اور پیرس میں دن گزارے اور اپنے مشہور عربی رسالہ "**العروۃ الوثقیٰ**" کے ذریعہ سے مسلمان اقوام کو اس کی دعوت دیتے رہے اور آخر اسی دعوت کی کوششوں میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

ہندوستان میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کے تنزل کا سبب جدید یورپین علوم و فنون و اختراعات و تمدن سے ناواقفیت کو قرار دیا۔ اور اس کا علاج ایک ایسی درس گاہ کا قیام تجویز کیا جو مسلمانوں کو یورپین تمدن و معاشرت اور علوم و فنون و مخترعات سے آراستہ کرے، ان کا قول تھا کہ مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جاؤ۔

قومیت پرست یورپ کے اثر سے مصر، ٹرکی و ایران میں اسلامیت کے بجائے وطنیت کی دعوت شروع ہوئی، جس میں یہ قرار دیا گیا کہ اتحاد اسلامی کے بجائے، اتحاد وطنی

---

(۱) مولانا ندوی رحمہ اللہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت زندہ تھے، غفر اللہ لہ ورحمہ۔ (ناشر سابقہ ایڈیشن: دار الدعوۃ السلفیہ، لاہور)

وقومی، کی بنیاد پر نئی تعمیر شروع کی جائے، چنانچہ ان سب ملکوں میں ''وطینت'' کی دعوت نے بڑا حسن قبول حاصل کیا۔ مصر میں مصطفی کامل، ایران میں مفتی زادہ وغیرہ نے اور ٹرکی میں نوجوان ترکوں نے اپنے انقلاب کے لیے اسی راستہ کو اختیار کیا۔

گذشتہ جنگ میں روس کے کامیاب انقلاب نے ایک اور منظر پیش کیا، جس سے سوشلزم، بالشویزم، کمیونزم وغیرہ کی تحریکیں سامنے آئیں۔ ان کو دیکھ کر بعض مسلمان مفکرین نے اسلامی نظام سیاست واقتصاد و معاشرت کو بھی اسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی۔ ادھر جرمنی اور اٹلی میں اس کے رد کے طور پر نازی ازم اور فاشزم نے جنم لیا۔ بعض مسلمان نوجوانوں کو جن میں کچھ مذہبی درد تھا، اسی جنگی اور آمرانہ نظام میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا خواب نظر آیا۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے جو مسلمان نوجوان یورپ کو گئے وہ سوشلزم یا نازی ازم میں سے کسی ایک کا شکار ہو کر واپس آئے۔ پہلا نظریہ دہلی کے خیری برادرس کی جماعت اسلامی اور امرتسر کے مشرقی صاحب کی ''خاکسار'' تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خیری بھائیوں کی تحریک تو ان کے گھر کی چاردیواری ہی میں محدود رہی۔ ان کا بڑا زور وحدت آمریت پر ہے۔ لیکن مذہبی اصول وفروع میں انھوں نے تاویل وترمیم نہیں کی۔ لیکن مشرقی تحریک نے وحدت آمریت کے ساتھ عسکریت پر زور دیا اور کوشش کی کہ اسلام کے پورے دین کو انہیں دو اصولوں پر ڈھال دیں اور ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ سراسر ''ماوراء الحیات'' زندگی پر مرے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو بتایا کہ ان کی جنت و دوزخ اسی دنیا میں ہے، یورپ کی زندگی کا باغ و بہار، جنت ارضی اور مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی ان کا دوزخ ہے۔ اس لیے آج یورپ اصلی مسلمان اور مسلمان حقیقی کافر ہے۔

ہندوستان پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوئی کہ عین تنزل اور سقوط کے آغاز میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وجود نے مسلمانوں کی اصلاح و دعوت کا ایک نیا نظام

مرتب کر دیا تھا۔ اور وہ "رجوع إلى دين السلف الصالح" ہے۔ اس دعوت نے ہندوستان میں فروغ حاصل کیا۔ اور گو سیاسی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ تاہم نظری و مذہبی و علمی حیثیت سے اس کی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم رہیں، جن کو ہندوستان کا سیاسی انقلاب بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ اس سیاسی انقلاب کے بعد گو اس دعوت کے ارکان ہندوستان کے مختلف اسلامی ریاستوں کو یا ہندوستان سے باہر حجاز کو ہجرت کر گئے۔ مگر چند باہمتوں نے اسی نظری و مذہبی و علمی نظریوں کی دعوت، اشاعت اور تعلیم کی غرض سے دیوبند اور سہارنپور میں اسلام کی مذہبی درس گاہوں کی بنیاد رکھی، اور ان کے ذریعہ سے افغانستان سے حجاز تک اس تحریک کو پھیلا دیا۔ اس تحریک کا اولین اصول یہ تھا کہ اسلام کو بدعات سے پاک کر کے علم و عمل میں سلف صالحین کی راہ پر چلنے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔ (۱)

اسی زمانے میں یمن اور نجد میں اس تحریک کی تجدید کا خیال پیدا ہوا۔ جس کو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ نے مصر و شام میں شروع کیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی منجمد تقلید اور بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں یہ تحریک ہندوستان تک بھی پہنچی اور خاص ولی اللّٰہی تحریک کے ساتھ آ کر منضم ہو گئی۔ اسی کا نام ہندوستان میں اہل حدیث ہے۔

ولی اللّٰہی تحریک کی یہ دونوں شاخیں تقلید و عدم تقلید کے مباحث کے علاوہ اصول میں تقریباً ایک تھیں۔ مگر افسوس کہ ان فقہی فروعات کو ان دونوں نے یہ اہمیت دی کہ ہندوستان

---

(۱) لوگوں نے اس کو بھی مختلف فیہ مسئلہ بنا رکھا ہے کہ وہ فقہ میں کیا تھے؟ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے خود اپنے سوانح الجزء اللطیف کے آخر میں اپنے کو خود ہی بتا دیا ہے کہ وہ کیا تھے؟ فرماتے ہیں:

"وبعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشاں و احادیثے کہ متمسک ایشاں است قرار داد خاطر بمدد نور عینی روش فقہاء محدثین افتاد۔"

کے طول و عرض میں سالہا سال تک دست و گریباں ہو کر اپنے اصل مقصد سے ہٹ گئیں۔ یہ دیکھ کر ندوۃ العلماء کے نام سے ایک اور دعوت پیدا ہوئی، جس نے ان فروعات میں اپنا مسلک صلح کل تجویز کیا۔ اور چاہا کہ دونوں کو بغل گیر کر کے اصل مقصد کی طرف متوجہ کرے اور یہ دیکھ کر کہ جب تک ہمارے علمائے کرام کے تعلیمی نظام میں تبدیلی نہ ہوگی وہ علماء پیدا نہیں ہو سکتے جن کی ضرورت اس وقت کے مسلمانوں کو ہے، اس تعلیمی نظام کے دو جزء اہم تھے، ایک یہ کہ اسلامی فرقوں کے باہمی فروعات کے جنگ وجدال کو بند کر کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ یونانی علوم کو جن کو صرف بہ ضرورت ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا۔ ان کو علیحدہ کر کے ان کے بجائے یورپ کے وہ جدید علوم اختیار کیے جائیں جن پر موجودہ عقلیت کی بنیاد ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ٹرکی کی بربادی اور ممالک اسلامیہ کی تجزی نے ہندوستان کے اُن مسلمانوں کو جو اب تک اپنے کو ایک خلافت کے مرکز سے وابستہ سمجھتے تھے بے حد متاثر کیا۔ اس سے خلافت کے نام سے ایک نہایت پر جوش تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کی وسعت میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کی ہر مسلمان قوم آ گئی۔ یہ حقیقت میں اتحاد اسلامی کی تحریک کا آخری سنبھالا تھا۔ خیال تھا کہ یہ قوت شاید مسلمانوں کے لیے نئی زندگی کا پیغام لائے گی۔ اس تحریک کے تین اصول اساس تھے:

(۱) مسلمان خلافت الٰہی کے حامل ہیں۔ (۲) ان کا ارضی مرکز جزیرہ نمائے عرب۔ (۳) اور سیاسی مرکز ترکی خلافت ہے۔ لیکن عین اس وقت جب یہ تحریک شباب پر تھی، مصطفیٰ کمال پاشا نے الغائے خلافت کا اعلان کیا۔ اور ترکی کو اسلامی اقوام کی نمائندگی کے عہدہ سے علیحدہ کر کے ایک ترکی قوم کی بنیاد ڈالی جس نے اسلام کے ہر رشتہ کو توڑ کر یورپ کے ہر نظام کو 'ترکی قومی رنگ' دے کر قبول کر لیا۔ اس اعلان نے ہندوستانی مسلمانوں کی خلافت نام اسلامی تحریک کی قوت کو بالکل ختم کر دیا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھیے کہ پنجاب کے علاقہ سیال میں ایک سکھ خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس نے سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا اور بعض علماء کے زیر تربیت عربی تعلیم حاصل کی اور مزید تکمیل کے لیے وہ دیوبند کی درس گاہ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ میں پہنچ گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر عبیداللہ سندھی کے نام سے روشناس ہوا۔ ظاہری تعلیم کے ساتھ وہ اُس جوش جہاد سے بھی آشنا ہوا، جو منتسبان سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما کے دلوں میں موجزن تھا۔ اور جس کو ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال نئی حرکت دے رہا تھا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکی و جرمنی کے اتحاد کی قوت کے بھروسہ پر بعض مذہبی و سیاسی ارباب فکر کے خیال میں آیا کہ یہ وقت اُن کے پرانے منصوبے کے پورا ہونے کے لیے سب سے موزوں ہے۔ چنانچہ کچھ کام شروع ہوا مگر ابھی آغاز ہی تھا کہ قید و بند کی زنجیروں نے ان میں سے اکثروں کو قبل از وقت بیکار کر دیا۔ شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنی جماعت کے ساتھ حجاز کو ہجرت کی اور آخر وہاں بھی پناہ نہیں ملی اور مالٹا میں اسیر رہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے بعض رفقاء نے ہندوستان سے نکل کر آزاد سرحد اور افغانستان کا رُخ کیا۔

قلم یہاں تک پہنچا تھا کہ اخبارات سے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی وفات کی اطلاع ملی رحمۃ اللہ علیہ ـــــ یہ معاملہ اگر ذات کا ہوتا تو یہ تحریر یہیں ختم ہوجاتی، مگر افسوس کہ یہ ذات کا نہیں بلکہ دین کا ہے۔ پھر گو وہ خود اس دنیائے دنی سے رخصت ہو گئے۔ مگر اپنے خیالات کو اپنے دوستوں کی تحریروں کے ذریعہ سے خلعت دوام بخش گئے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ موجود ہیں، وہ زیر بحث آتے ہی رہیں گے ـــ تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان کو اسلام سے بڑی محبت تھی اور اس کی دنیاوی برتری کے لیے ان کے اندر بڑا جوش تھا۔

سلسلہ بیان یہ تھا کہ پچھلی جنگ عظیم کے موقع پر ۱۹۱۵ء میں وہ افغانستان چلے گئے

جہاں وہ مسلسل سات برس تک مقیم اور وہاں کے سیاسیات سے الجھتے رہے، پھر یہاں کی فضا کو بدلتی دیکھ کر ۱۹۲۲ء میں وہ روس چلے گئے جہاں بالشویکی انقلاب پورے زور پر تھا۔ یہاں وہ اس بالشویکی تحریک سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء کے قریب وہ روس سے بھی نکل گئے، اور مصطفیٰ کمال پاشا کے ٹرکی میں جا کر مقیم ہوئے۔ اور وہاں چار سال کے قریب رہ کر وہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ ہو کر سلطان ابن سعود کے عہد میں حجاز چلے آئے۔

یہ مختصر تاریخ اس لیے لکھ دی گئی کہ ان کے خیالات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو دفعتاً کسی تالاب سے سمندر میں پہنچ جائے ان کا تعلق ایک ایسے حلقہ سے تھا جس کو یورپ کے نئے سیاسیات سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ لیکن دفعتاً واقعات نے ان کو سیاسیات عالم سے الجھا دیا۔ اور وقت کی اہم تحریکوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ خالص ملحدوں اور فاسقوں اور سیاسیوں اور انقلابیوں سے ملنے اور یورپ کے مختلف سیاسی و معاشرتی و اقتصادی نظامات کے دیکھنے اور ان کے نظریوں کے سننے کا موقع ملا۔ معلوم نہیں کہ جہاں جہاں وہ رہے وہاں کی کوئی زبان بھی ان کو معلوم تھی یا نہیں۔ بہر حال یورپ کے ان سیاسی نظریوں اور انقلابی تحریکوں سے ان کے خیالات میں چکا چوندسی لگ گئی۔ ان کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ وہ کسی طرح اسلام کو اس نئی تحریک سے منطبق کر دیں، بہر حال انہوں نے روس سے سیاسی انقلاب کا سبق اور ٹرکی سے تجدد کا فن اخذ کیا۔ اور پھر جدید ٹرکی سے وطنیت اور یورپ کی ظاہری نقالی کے درمیان تطبیق کا نظریہ مرتب کیا۔ مختصر یہ کہ اُنہوں نے جدید روس اور جدید ٹرکی کو اپنے پرانے علوم پر منطبق کر کے ایک نظام تیار کیا جس کو لے کر وہ ہندوستان وارد ہوئے، اور ''حکمت ولی اللہ'' کے نام سے اس کو پیش کیا۔

ان کے نزدیک اس زمانہ میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ''ہندوستانیت'' اور ''اسلامیت'' کو کیوں کر منطبق کیا جائے، اس کا جواب ان کے ذہن میں یہ آیا کہ جس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں جہاں وطنیت کا دور دورہ ہے۔ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے

کہ اسلام سے قطع نظر کر کے نسلیت اور وطنیت کے اصول پر ملک کے مختلف طبقات کو جن میں مذہب کا اختلاف ہے، متحد کیا جائے، قوم پرست عرب کہتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی عرب تھے۔ اور اب بھی عرب ہیں۔ ہم عیسائی ہوں یا مسلمان، سب عرب ہیں۔ مصری کہتے ہیں کہ ہم عرب ہوں یا ترک وکرد یا قبطی ہم سب مصری ہیں۔ ہم کو فراعنہ پر فخر ہے اور اہرام مصری کی بنیاد پر ہم اپنی قومیت کی بنیاد کھڑی کریں گے۔

اسی طرح ایران میں ایرانی، نسل ووطن کی پرستاری میں مصروف ہیں، مسلم وزرتشی اور موحد آتش پرست سب یکساں ایرانی ہیں۔ یہی حال جدید ٹرکی میں ترکی نسل کی دعوت کا ہے کہ اب وہاں چنگیز وہلاکو پر فخر کیا جارہا ہے۔ سلطان عثمان اور بایزید وسلیمان پر نہیں۔

مولانا سندھی نے اسی منظر کو دیکھ کر دین اور وطنیت میں تطبیق کی کوشش کی اور اس کے لیے انہوں نے اسلامی مسائل کی تشریح میں ایسی تاویلات کیں کہ وہ ان کے فلسفہ پر منطبق ہو جائے بعض حقائق صحیح بھی ہیں، تو ان کی تعبیر کا طرز ایسا اختیار کیا گیا جس سے وہ متوحش ہو گئے ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جن کو وہ صحیح متفقہ اصول سے بھی اخذ کر سکتے تھے، مگر انہوں نے ان کے لیے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا، مثلاً ''وحدت انسانیت'' کے مسلک کو 'وحدۃ الوجود' کی سنگلاخ زمین کے بجائے کتاب وسنت کی صاف راہ مساوات بنی آدم پر مبنی کر سکتے تھے، جس کے نصوص قرآن پاک واحادیث میں موجود ہیں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ دین اور وطنیت کی تطبیق کے لیے عربی اسلام کو ہندی اسلام بنا کر یہاں کی وطنیت سے قریب کر دیا جائے، تاکہ وہ اس ملک آریہ ورت میں بیگانہ نہ سمجھا جائے۔ اور اس طرح دین ہندوستان میں وطنیت کے مہلک اثر سے بچ جائے۔ چنانچہ ان کو حنفیت سے اس لیے دلچسپی نہیں کہ وہ دلائل کے لحاظ سے قوی اور اپنی حجت کے لحاظ سے پرزور ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان کی عصبیت اس لیے ہے کہ امام صاحب نسلاً غیر عرب بلکہ عجمی بلکہ ہندی بلکہ سندھی تھے، اور اس لیے حنفیت ہندیت ہے۔ ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سے اس لیے

عقیدت نہیں کہ قرآن وحدیث سے اس کی تائیدیں مل سکتی ہیں، اور ربط حادث یا قدیم کے فلسفیانہ معمے کا حل اس کے ذریعہ سے آسانی سے ہوجاتا ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ یہ مسئلہ ہندو ویدانت میں بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجود کی صورت میں ملتا ہے اور اس لیے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ عقیدہ مضبوط کڑی کا کام دے سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ وہ ساری انسانیت کو ایک کر سکتے ہیں۔ تصوف کو ہندو یوگ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی اسی اصل کی فرع ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور ان کے بابرکت خانوادہ سے اس لیے گرویدگی نہیں کہ ان کے برکات ہندوستان میں من جانب اللہ مؤید اور مشاہد ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ یہ ہندی نژاد خانوادہ ہے۔ اور اس کی تلقینات و ہدایات وتاویلات وتعبیرات کے اختیار کرنے سے وہ 'عربی اسلام' کو 'ہندی اسلام' بنا سکتے ہیں، اور اس سلسلہ سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکبر ایک ہی ''ہندی دین الٰہی'' کے مبلغ بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن دین کی تخریب کے لیے اس سے زیادہ بھی کوئی مہلک اور خطرناک راہ ہوسکتی ہے؟ جن شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کو اکبر کے ناتمام کام کا تکمیل کرنے والا بتایا جاتا ہے، اُن کا فتویٰ اکبر کے باب میں جو کچھ ہے، وہ ان کی ''انفاس العارفین'' کے اس فقرہ سے ظاہر ہے:

> ''جلال الدین اکبر پادشاہ او را معظم ومفخم داشتے وبعد ازاں کہ بادشاہ الحاد و زندقہ گرفت، آں رشتۂ الفت از ہم گسست وتنفر تمام از ہر دو جانب بظہور پیوست۔'' (ص:۱۶۰)

ایک طرف تو وطنیت کے یہ سلسلے ہیں، دوسری طرف مصطفیٰ کمال پاشا کی 'قدیم' سے علیحدگی اور یورپ کے ''جدید'' معاشرت، تعلیم، خط، لباس اور تمدن وغیرہ کی پیروی کا تخیل ہے جس کو مولانا نے اپنی ''وطنیت'' کے نظریہ کے ساتھ آمیز کیا ہے۔ اور اس لیے عربی و فارسی خط کے بجائے لاطینی خط اور علماء کو کوٹ، پینٹ اور ہیٹ لگانے کا مشورہ دیتے ہیں،

تیسری طرف روسی انقلاب کے بعض دفعات کو شاہ ولی اللہ صاحب کی "بدور بازغہ" اور "حجۃ اللہ"، وغیرہ کی مجمل ومبہم عبارات واشارات کے بھروسہ پر اپنے نظام میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ یہ ہے مولانا سندھی رحمہ اللہ کے سارے افکار وخیالات کی اساسی بنیاد جس کے ساتھ یوروپین انقلابی نظریوں کے کچھ کچے پکے سنے سنائے اصول ہیں جن کو اسلامی مسائل کی چھان بین میں صرف کرتے رہے۔ العجب! مسئلہ خلق قرآن کو عربیت اور عجمیت کی نزاع بتانا کس درجہ غلط بات کا دعویٰ کرنا ہے؟ ذرا وہ اُن علماء کے نسب ونسل ووطن اور زبان پر تو نظر کر لیتے جو اس نزاع میں ادھر یا اُدھر سے شریک تھے۔ ایک خالص دینی مسئلہ کو جو درحقیقت جیسا کہ امام ابن حنبل نے خود "الرد علی الجھمیۃ"، میں اور امام بخاری نے "خلق افعال العباد"، میں لکھا ہے، اسلام اور عیسائیت کی جنگ تھی۔ عربیت و عجمیت کی جنگ بتانا تعجب انگیز ہے، پھر مسئلہ کی جو تعبیر فرمائی ہے، وہ معتزلہ کا مسلک نہیں، وہ تو اشاعرہ اور حنابلہ کا اختلاف ہے، جو مامون کے بہت بعد وجود میں آیا، مولانا کا یہ کہنا کہ عجمی ذہن وعقل کے لیے اللہ کی عالمگیر تعلیم کی کتاب کا صرف عربی زبان میں الہام قرآنی ہونا سمجھنا ناممکن ہے۔ عرض ہے کہ اگر ایسا سمجھنا محال ہے تو آریوں سے کہیں کہ وہ ویدوں کو عالمگیر دین کی کتاب نہ کہیں۔ اور نہ سنسکرت کو الہامی سمجھیں۔ ایک عجمی نہیں بلکہ ہندی کے ذہن کے لیے یہ ناممکن ممکن کیوں کر ہو گیا، اس مقام پر مولانا کے لیے ضروری تھا کہ قرآناً عربیاً اور حکماً عربیاً کی بھی مناسب تاویل کر دیتے تاکہ قرآن پاک کے ساتھ عربیت کے وصف کا عارضی ہونا مسلمانوں (جن کو وہ "عامہ" کہہ رہے ہیں) کے نزدیک مسلم ہو سکتا، اسی طرح اسلامی تصوف کو "جوگ" اور "ویدیت" سے ماخوذ بتانا محض یورپ کی آواز کی نقالی ہے، جس کو اس کا دعویٰ ہو اس کو چاہیے کہ ائمہ تصوف کے رسائل ومسائل کے حوالہ سے اس کو ثابت کرے۔ اگر کسی نے "جوگ" کا ایک آدھ شغل اختیار کر لیا ہو تو اس سے پورا علم اور پورا فن تو "جوگ" نہیں ہو جائے گا، کیا طبیبوں نے اگر بیدک کے ایک دو

نسخے اپنی کتابوں میں لکھ دیئے تو اس سے پورا فن طب ''بیدک'' ہوجائے گا؟

مولانا سندھی کے افکاروخیالات کی بوالعجبی کا پتہ اہل دیوبند کوتو ۱۹۱۲ء میں ہی مل گیا تھا۔ جب وہ معتمر الانصار کی دعوت لے کر اٹھے تھے اور آخر وہ معتمر سے دست کش ہوکر دلّی میں مسجد فتح پوری کے اندر نظارۃ المعارف القرآنیہ بنا کر بیٹھے اور چند انگریزی وعربی کے فارغ التحصیل اور نیم فارغ التحصیل طلبہ کو قرآن کا درس دینے لگے، ان کے اس درس کا منشاء یہ تھا کہ پورے قرآن کو جہاد وسیاست ثابت کیا جائے اور تمام احکام کو اس جنگی رنگ میں پیش کیا جائے، اس تفصیل کی جھلک آپ کو ان کے تلامذہ مثلاً خواجہ عبدالحئ صاحب فاروقی کی تفسیر اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے قرآنی حواشی میں پوری طرح نظر آئے گی۔ افغانستان پہنچ کر ان کے مذہبی خیالات کے تغیر کی خبر خواص کو برابر پہنچتی رہی اور تردید کرنے والے تردید کرتے رہے اور روس وٹرکی پہنچ کر تو ان کے خیالات کا انقلاب اوج کمال تک پہنچ گیا۔ ان کے قیام حجاز کے زمانے میں جو لوگ ہندوستان سے حجاز کو جاتے رہے اور ان سے ملتے رہے، وہ ان کے اجنبی اور بیگانہ خیالات کو سن کر جس عقیدت سے ان کی مجلس میں جاتے تھے، اس عقیدت کے ساتھ واپس نہیں آتے تھے، ان کی ہندوستان کی واپسی کا سیاسی ومذہبی دونوں گروہوں کو انتظار تھا، لیکن افسوس جب وہ واپس آئے تو نہ تو وہ پہلے گروہ میں مقبول ہوئے اور نہ دوسرے گروہ میں — یہ خاکسار بھی ان لوگوں میں ہے جو ان کی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے تک اپنے بزرگوں کے اور ان کے تعلقات کے سبب سے ان کے ساتھ عقیدت رکھتا تھا اور مولانا بھی شفقت فرماتے تھے۔ لیکن جب سے ''معارف'' نے ان کے خیالات کی تردید میں حصہ لیا، وہ ارتباط باقی نہیں رہا۔

اب مولانا رحمہ اللہ اس عالم میں ہیں کہ جہاں ان کو نہ ہماری مدح وستائش کا کوئی فائدہ ہے اور نہ تردید وتنقید سے کوئی نقصان۔ اب وہ وہاں ہیں جہاں ان پر سارے حقائق منکشف ہوچکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کا مقام اعلیٰ کرے۔

آج کل کی تمام نئی تحریکوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ ان کے بانی ومبلغ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی اصلی غایت، اہل دین کا دنیاوی فروغ، اور ظاہری شان وشکوہ اور ملکیت ارض ہے اور اسی لیے ان کی نظر میں دینی احکام اور تعلیمات سیاسی واجتماعی ذرائع نظم وانتظام ہیں۔ اور یہ وہی ابلہ فریبی ہے جس میں کبھی باطنیہ اسماعیلیہ اور قرامطہ مبتلا رہے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کس نکتہ وری سے اپنی حسب ذیل عبارت[1] میں اس حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے:

الذین هم فی الباطن من الصابئة الفلاسفة الخارجین عن حقیقة متابعة المرسلین، الذین لایوجبون اتباع دین الإسلام، ولا یحرمون اتباع ماسواه من الادیان، بل یجعلون الملل بمنزلة المذاهب والسیاسیات التی یسوغ اتباعها و ان النبوة نوع من السیاسة العادلة التی وضعت لمصحلة العامة فی الدنیا فان هذا الصنف یکثرون و یظهرون اذا کثرت الجاهلیة واهلها... و هؤلاء لایکذبون بالنبوة تکذیبا ببعض احوالها و یکفرون ببعض الاحوال وهم متفاوتون فیما یومنون به و یکفرون به من تلك الحلال فلهذا یلتبس امرهم بسبب تعظیمهم للنبوات علی کثیر من اهل الجهالات. (منهاج السنة، ج:۱،ص:۳)

(۱) فاضل دوست مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس عبارت کا نشاں لگایا ہے ان کا اصل خط ''معارف'' (ستمبر ۴۴ء) میں چھپ رہا ہے۔

''درحقیقت صابیوں میں ارباب فلسفہ کا جو گروہ ہے یہ لوگ بہ باطن وہی ہیں، سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جو اصل حقیقت ہے اس کے دائرہ سے یہ باہر ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو دین اسلام کی پیروی کو ضروری نہیں خیال کرتے اور اسلام کے سوا دنیا کے دوسرے مذاہب وادیان کی اتباع کو حرام نہیں سمجھتے، بلکہ دنیا کے تمام ملل وادیان کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مختلف طریقے اور سیاسی ادارے ہیں جن میں سے جس کی بھی آدمی چاہے پیروی کرسکتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت بھی دراصل ایک قسم کی سیاست ہی ہے لیکن ایسی سیاست جس کی بنیاد عدل اور توازن پر قائم ہے۔خیال ان کا یہ ہے کہ عوام کی دنیاوی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنانے والوں نے اسے بنالیا ہے۔اس قسم کے لوگوں کی کثرت اس وقت ہوجاتی ہے اور اس زمانہ میں ان کا ظہور ہوتا ہے جب جاہلیت پھیل جاتی ہے اور جاہلیت والوں کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے... نبوت کی تکذیب کامل طور پر مطلقاً یہ نہیں کرتے بلکہ بعض چیزیں مانتے ہیں اور بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں پھر اس مسئلہ میں یعنی نبوت کی کن باتوں کو مانا جائے اور کن کا انکار کیا جائے ان کے خیالات میں باہم اختلاف بھی ہوتا ہے نبوت اور پیغمبرانہ ہداتیوں کی چونکہ یہ احترام بھی کرتے ہیں اس لیے ان کی اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس عبارت کو سامنے رکھ کر ''مولانا عبیداللہ سندھی'' نام کتاب کے اگلے دو ابواب ہی پڑھ لیے جائیں۔

آج کل یورپ کی موجودہ سیاسی تفوق، مادی تمدن کی چمک دمک، معاشرتی آزادی، دولت کی افراط اور عسکری قیامت آفرینی نے اچھے اچھے دین داروں کے پاؤں اکھاڑ دیے ہیں اور اس چیز کو جسے قرآن پاک نے ''ظاهراً من الحياة الدنيا'' کہہ کر اہل

ایمان کو اس سے بلند تر زندگی کی دعوت دی تھی۔ آج مسلمانوں کو اس سے نیچے اتار کر "ظاهراً من الحياة الدنيا" کی پست سطح پر قائم رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے بلکہ اسی کو اصل زندگی بتایا جارہا ہے۔ فیا اسفیٰ!

دین صرف اطاعت الٰہی کا نام ہے، اس لیے بلاشبہ دین کی بلندی قامت اور اس کے کلمہ کے اعلاء کی راہ میں جدو جہد اور قتال فریضۂ امت ہے اور اس کے پورے شعبوں کو بروئے کار لانے کے لیے اقامت دین کے اس شعبہ سے بھی چارہ نہیں جس کا نام زمین کی بالآخر قوت آمرہ یا حکومت دینیہ ہے بلکہ خالص اطاعت الٰہی اور اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جس مومن کے دل میں مجبوریوں کے باوجود حصہ لینے کی تمنا اور آرزو یا حدیث نفس بھی نہ پیدا ہو وہ کمال ایمان سے محروم ہے۔ لیکن یہ فرض حیات دنیا کی آرائش کے لیے نہیں، بلکہ حیات اخروی کے فوز وفلاح کی نیت سے ادا کیجئے مگر مولانا کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی صرف اس پر موقوف ہے کہ اس وقت بلا تأمل "یورپ کے مادی اور معاشی اصول زندگی کو قبول کرلیں" گو معلوم نہیں کہ یورپ کے مادی اور معاشی اصول زندگی سے کیا مراد ہے؟ تفصیل بتانا چاہیے۔

مولانا کا یہ کہنا ممکن ہے سچ ہو کہ اب خلافت راشدہ دنیا میں لوٹ کر نہیں آسکتی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کو مطلق حکومت نہیں، بلکہ خاص نوع کی حکومت مطلوب ہے کیوں کہ اسلام میں "استخلاف فی الأرض" ایمان کامل اور عمل صالح کے ساتھ محدود ہے۔ اس لیے براہ راست "استخلاف فی الأرض" کی یہ دعوت غلط ہے اور ایمان کامل اور عمل صالح کی اصل دعوت دے کر اس کے نتیجہ میں "استخلاف فی الأرض" کی امید عین مطلوب ہے۔ پہلی دعوت کا منشاء صرف متاع الحیاۃ الدنیا کی تلاش ہے جس کی قرآن پاک نے تحقیر کی ہے اور دوسری دعوت عین اسلام اور عین دین ہے جس کا منشاء "ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان" کی حقیقی تفصیل اور "إن الدنیا خلقت لکم و

إنكم خلقتم للآخرة،، (دنیا تمہارے لیے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو) کی اصلی تصویر ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مولانا سندھی جیسا عالم متبحر یوروپین انقلابات اور جدید سیاسی افکار میں اُلجھ کر حجاز سے ترکستان کی راہ چل پڑا۔ ممکن تھا کہ مولانا کی وفات پر ان کے خیالات کی بھی وفات ہو جاتی مگر افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات کی ترتیب و تہذیب و اشاعت کا فرض ایک خاص ادارہ (سندھ ساگر اکیڈمی) کی طرف سے سرانجام پایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان خیالات نے اپنے بانی کی زندگی کے بعد بھی اپنی زندگی کا سامان کر لیا ہے۔

ملک میں یہ خیالات برملا ظاہر کیے گئے اور ان کی دعوت پر دعوت دی گئی، بلکہ اس کی ترتیب و اشاعت میں بعض علماء نے بھی حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ان کے پہلے رسالہ میں شاہ ولی اللہ صاحب سے لے کر مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک کے پورے سلسلہ کو آج کل کے لینن اور ٹراٹسکی اور اسٹالن کی شکل میں پیش کیا گیا اور ان خدا پرستوں کو دنیا پرست سیاسی پارٹیوں کے طریق دعوت کا نمائندہ بنایا گیا اور یورپ کے سیاسی پارٹیوں کے اصول کو پیش کر کے اپنے مخالف پارٹی کے علماء کے قتل کی تحسین [1] کی گئی۔ انا اللہ!

یہ سب کچھ اس ہندوستان میں ہوا جہاں بحمد اللہ علمائے دین اور مجاہدین حق کی کمی نہیں۔ مگر پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی۔ انہوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پُرزور مضامین لکھے اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی، اور اب ان کے یہ متفرق نمبر ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناقد مجیب کے اس رسالہ کو قبول اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ نصیب فرمائے۔

والسلام

---

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کا سیاسی مسلک: ص: ۲۰۲۔

خطوط

(۱)

محترم المقام مکرمی مولانا مسعود عالم صاحب۔ زید مجدہ

سلام مسنون۔ ''معارف'' کے دونوں نمبر آج ملے — ہماری سیاست میں ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہمارا سیاسی فکر بدل گیا۔ اسے ہم نہیں چھپاتے، کاش ہمارے دوست ہم سے اسباب انقلاب بھی سن سکتے۔ افسوس ہے کہ وہ معاملات ہم لکھوا نہیں سکتے۔ اس کے بعد ان کی رائے سے ہمیں شکایت نہ ہوتی — آپ براہ مہربانی شیخ عبدالحق بنارسی کا ترجمہ سلسلۃ العسجد میں دیکھ لیں جو نواب صاحب نے سلسلہ اسانید سے آخر میں ذکر کیا ہے — ان کے اخراج کا واقعہ ایک رسالہ میں چھپا ہوا ہم نے مکہ معظّمہ میں پڑھا تھا۔ وہ رسالہ مولانا احمد سعید کے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا مطبوع ہے۔ شاہ عبدالغنی کی اس پر مہر ہے، شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے فتاوے بھی اس میں درج ہیں، اور سید محمد علی رامپوری کا مختصر بیان بھی مذکور ہے۔ اگر کہیں سے مل سکے تو اسے ضرور دیکھیے — ہمارا یہ فقرہ ''کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک سازش'' آپ غلط محل پر لے گئے۔ اس قدر بدگمانی نہ کرتے تو اچھا ہوتا — اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود تھا — جو مولانا حمید الدین رحمہ اللہ سے ہم نے سنا تھا کہ ان کے اطراف کے کوئی ملازم کمپنی سرحد میں گئے۔ اور مجاہدین اور افغانوں میں نفاق کا بیج بو آئے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ مجاہدین مع

اپنے سرداروں کے شہید ہو گئے تو وہ اپنے آپ کو الٹا بندھواتے اور کوڑوں سے پٹواتے۔ یہ عمل وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسلسل جاری رکھتے رہے۔

زیدیہ اثنا عشری کی طرح نہیں مگر وہ شورائی حکومت نہیں برداشت کرتے۔ امام خصوصی خاندان سے ہونا چاہیے۔ ہمارا زمانہ اس سیاست کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ان مسائل میں اختلاف رائے معیوب نہیں، مگر ایسی غلط فہمی نہ ہو جس کا اثر یہاں تک پہنچ جائے کہ مجاہدین کمپنی سے سازش رکھتے تھے — یہ ہمارا خیال ہے — یہ فقرہ ہم عرب انقلابیوں کے لیے تو استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا وہ لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ ہم تو ہندی اور عربی انقلابیوں میں یہی فرق قرار دیتے ہیں کہ کمپنی عربوں کی امداد کرتی رہی۔ اور ہندیوں سے اس کا مقابلہ تھا۔

واللہ المستعان ۲۶/مارچ ۱۹۴۳ء ہندی عبید اللہ سندھی

☆☆☆

(۲)

محترم المقام زید مجدہ سلام مسنون

آپ تنقید لکھ رہے ہیں، مبارک ہو۔ افکار اسی طرح صاف ہوتے ہیں۔ آپ کو مطالعہ میں مدد دینے کے لیے رات ایک خط لکھ چکا ہوں، وہ حضرت مولانا سید صاحب کے توسط سے آپ کو ملے گا۔ یہ دوسرا عریضہ براہ راست لکھ رہا ہوں۔

(۱) آپ نے مولانا ولایت علی کا مجموعہ دیکھ لیا ہے۔ غور سے مطالعہ کیجئے۔ مولانا سید صاحب (الامیر الشہید) رحمہ اللہ کو مہدی متوسط نہیں بنا رہا ہے۔

(۲) (اسمس) میں ایک مجموعہ اربعین احادیث ہے جو سرتا پا موضوع ہے، وہ عام لوگوں کو نہیں دکھلایا جاتا۔ پنجاب کے کسی مطبع میں چھپوایا ہے۔ اس میں ایسی حدیثیں بھی

درج ہیں کہ مہدی پشاور کے شمالی کوہستان میں ملے گا۔نواب صاحب نے اسی مجموعہ کا ذکر کیا ہے۔

(۳) کیا سوانح[1] احمدیہ کا مصنف الامیر الشہید کو انگریزی رعایہ بنا کر پیش کرتا ہے، اس سے یہ اچھا نہیں ہوگا کہ وہ اپنی تحریک کے ڈکٹیٹر تھے۔ غلطیاں ہوئیں، مگر اماموں اور ڈکٹیٹروں کی سی غلطیاں ہیں۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

آپ مجھے ایسا خیال کریں کہ دنیا کے لادینی ڈکٹیٹروں کے مقابلہ میں آنا چاہتا ہوں یا متدین نوجوانوں کو ان کے مقابلہ کی ہمت افزائی کرتا ہوں۔ ہمارے متدین نوجوان کس راستہ سے آگے بڑھیں۔ وہ راستہ بتاتا ہوں۔عزیزوں کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔غلطیوں پر متنبہ کریں۔فوراً اصلاح کرلوں گا۔مگر خدا کے لیے جمود چھوڑ دیں۔آگے بڑھیں — میرا تجربہ ہے ہم اگر دلی کے بادشاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں تو کابل، قسطنطنیہ وغیرہ ممالک میں کہیں بار نہیں پاتے۔ یہ بادشاہ ہمارے ہیں ان کے غلط کاروں کی غلطیاں پکڑنا ہمارا فرض ہے۔اپنے گھر میں پاؤں ٹکانے کے لیے جگہ نکالیے پھر مسلمانوں سے ملیے، ان سے سیکھئے، اگر کوئی مفید بات آپ نے بزرگوں سے محفوظ کرلی ہے، تو دنیا کو تعارف کرائیے۔

کیا آج یوروپین مفکرین کے مقابلہ میں آپ اپنا مفکر پیش کرتے ہیں، کیا ان ڈکٹیٹروں کی دنیا میں آپ اپنا ڈکٹیٹر اپنے لیے امام بنا کر آگے بڑھ سکتے ہیں — خدا کرے کہ آپ کی تنقید مجھے ہمت دلائے کہ یہی بات زیادہ صاف لفظوں میں لکھ سکوں۔ اللہ رب العزت ہم پر رحم کرے۔ کاش ہم کبھی مل بیٹھتے اور تدریجی انقلاب کی سیڑھیاں جس طرح ہم

---

(۱) سوانح احمدی کا مصنف ''الامیر'' کا تعلق امام عبدالعزیز سے کاٹنا چاہتا ہے غور سے مطالعہ کیجئے۔ چالاک مصنف غیر مسلم ہیں ان کی کتابیں یا ان کے اقتباس عربی رسالوں میں پڑھ چکا ہوں مکہ معظّمہ کے دوران قیام میں۔ فقط

نے طے کی ہے آپ کو ان کا نشان پتہ بتلاتے، فیصلہ آپ کا وہی زیادہ صحیح ہوگا جس میں ہر قسم کے معلومات سامنے آجائیں۔

عربک کالج کی اسکیم ذاتی مطالعہ کے لیے بھیجتا ہوں۔ والسلام

۲۶/مارچ ۱۹۴۳ء ہندی دارالرشاد عبیداللہ سندھی

(۳)

مکرمی المحترم۔ سلام مسنون۔

کل اپریل کا معارف ملا۔اس سے پہلے ایک پمفلٹ ''البرہان'' کو بھیج چکا ہوں جس میں بعض مجملات کی قدرے تفصیل ہے۔اس میں حضرت سید صاحب کے مشورے کا بھی خیال رہا ہے، مگر بیمار ہوں اور کوئی کتاب بھی پاس نہیں، اس لیے مختصر یادداشت کے طور پر لکھنا پڑا— اجماع کی تفسیر میں آپ ازالۃ الخفاء میں مذہب عمر کا رسالہ بلکہ اس رسالہ کا مقدمہ دو صفحہ ضرور دیکھ لیں — امام شوکانی زیدی امیر یا امام کے قاضی رہے ہیں۔ایک امیر کے وفات پر اس کے جانشین امام سے پہلے خود بیعت کی اور پھر عوام سے امام کے نام پر بیعت لینے کا واسطہ بنے، کیا کوئی غیر زیدی یہ وظیفہ ادا کر سکتا ہے۔ہمارا مطلب اس بحث سے امام شوکانی کی توہین نہیں، جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے بلکہ ہم نے ایک ایسا طائفہ دیکھا جو حنفیہ کو مشرکین کے درجہ پر مانتا ہے۔اور ہم ان کے ساتھ مدارات پر مجبور ہیں۔انہی لوگوں کو اپنی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے ہم نے زیدیت کی بحث چھیڑی تھی۔کیا حنفیت زیدیت سے بھی زیادہ قابل انکار ہے— زیدیہ میں سے ایک محقق اہل السنۃ کے لیے قابل تقلید مل سکتا ہے تو دیوبندی حنفیہ میں کیوں اس قسم کے عالم مستثنیٰ نہیں کیے جاتے۔یہ واقعات مکہ معظّمہ میں پیش آئے اور ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اس مخمصہ سے ہمیں نجات ملی ورنہ وہ لوگ ہمارے اخراج کی تدبیریں سوچ رہے تھے— ہمارا یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہم اپنے سیاسی انہماک کے غلبہ میں اسلامی فرقوں کی امتیازی چیزوں پر غور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعات کی مجبوری سے بقدر ضرورت حصہ لینا پڑا — اب ہند میں معاملہ بالکل نئی صورت میں پیش ہورہا ہے۔ گاندھی ازم کے مقابلہ میں ہمیں ایک فلاسفر پیش کرنا ضروری ہے۔ کیا ڈاکٹر اقبال کافی ہے۔ ڈاکٹر نتشے کو مانتا ہے تو علامہ مشرقی ڈارون کو، میں گاندھی کے متبعین کے ڈر سے ان حضرات پر جرح بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر ان کی تقلید بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے میں نے اپنے لیے مخلص امام ولی اللہ کی فلاسفی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، — اسے آہستہ آہستہ پیش کررہا ہوں۔

کیا امام ولی اللہ سیاسی متبوع بھی ہیں یا ان کی محض فکری بلند پروازی تھی، میں اپنے دیوبندی اسانید کی بنیاد پر ان کے سیاسی متبعین کا تسلسل قائم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ بیماری اور پریشان حالی سے غلطیاں بھی صادر ہوتی رہیں گی۔ حسب الامکان اصلاح کرتا رہوں گا ورنہ امید رکھتا ہوں کہ معاف کردیا جاؤں گا۔

آپ فراخ دلی سے تنقید کریں — ہم آپ کی جماعت سے علیحدگی اس لیے اختیار کرتے ہیں، کہ ہمارے اغلاط کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہ ہو۔ میں تو اس قدر کمزور ہوچکا ہوں کہ جنہیں میں اپنا سمجھتا ہوں وہ بھی منہ نہیں لگاتے۔ اس لیے ؏

اوروں پہ کیوں نزول بلا اپنے ساتھ ہو
اب ہم مکان شہر سے باہر بنائیں گے

کا معاملہ ہے۔ والسلام

۲۲/اپریل/۱۹۴۳ء بیت الحکمۃ - دارالرشاد عبیداللہ سندھی

(۴)

مکرمی، سلام مسنون۔ آپ کا کارڈ ملا۔ میرے خطوط پرائیویٹ ہیں۔ محض آپ کو مطالعہ کے لیے متوجہ کرنا منظور ہے۔ رائے بدلنے کی کوشش یا پبلک میں مرافعہ منظور نہیں۔

اگر خدا کو منظور ہے۔ اور ہم کبھی مل بیٹھے تو بہت سے معاملات پر مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں بیمار ہوں، زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔ والسلام

تمام رفقاء محترم سلام مسنون قبول فرمائیں۔

۲۳ رمئی ۱۹۴۳ء ہندی دارالرشاد۔ گوٹھ پیر جھنڈا

(۵)

مکرمی المحترم زید مجدہ — سلام مسنون۔ آج معارف دیکھا۔ کل ''برہان'' دیکھ چکا تھا۔ آپ کو وحدۃ الوجود کا مسئلہ سمجھنے میں لمبے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو کتابوں سے نشان دہی کر کے توسیع مطالعہ کے لیے راستہ بنانے میں مدد دوں گا۔ ہم نے امام ولی اللہ کی حکمت کے تعارف میں کچھ اشارات لکھے ہیں، بالفعل ان پر توجہ فرمائیے۔

آپ کو شبہ ہے کہ میں نجد و یمن اور زیدیت اور تشیع میں شاید اچھی طرح فرق نہیں کر سکتا۔ میں بارہ سال عرب میں رہا ہوں یمن اور نجد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارے ملک میں نواب صاحب کے اعوان یمن سے تعلق رکھتے ہیں اور میاں صاحب کے شاگردوں میں غزنوی (امرتسری) خاندان نجد سے وابستہ ہے۔ یہ دونوں مرکز امام ولی اللہ کو مانتے ہوئے ائمہ یمن اور نجد کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ کمپنی بہادر کے زمانہ میں یمن کے شیعہ علماء آتے رہے، وہ اپنے ادبی کمالات سے ہند کو متاثر کرتے رہے۔

اور امام ولی اللہ کے فکر کے سخت مخالف تھے۔ اس کے بعد نواب صدیق حسن سے قدرے پہلے مولوی عبدالحق ہند میں ایک مرکزیت کے مالک بن جاتے ہیں اور وہ زیدی ہیں امام ولی اللہ کے فکر سے ہٹاتے ہیں۔ پھر نواب صاحب نے قاضی شوکانی سے اتصال پیدا کیا۔ امام ولی اللہ کے مسلک سے مخالف دعوت شروع کر دی۔ برائے مہربانی ان معمولی معمولات کو اہمیت نہ دیا کریں۔

مولانا شہید کو امام ولی اللہ سے علیحدہ فرض کرنے کی غلطی سے پرہیز کریں۔ مولانا

شہید کی کتابوں کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ کا کارڈ مورخہ ۶؍مئی ملا۔شکریہ! یہ خط وکتابت محض دوستانہ ہےاور پرائیویٹ۔

والسلام

۱۴؍اگست ۱۹۴۴ء ہندی   گوٹھ پیر جھنڈا، ضلع حیدرآباد سندھ

(۶)

بجناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی دام عنایتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اس وقت بستر علالت پر ہیں۔ چند دن تک ان کی حالت نہایت تشویش ناک رہنے کے بعد اب پھر اللہ کے فضل سے روبصحت ہے۔کل آں ممدوح نے آپ کا ’’استدراک‘‘ جوآپ نے ان کی تاریخ تحریک ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ پر ماہ فروری تا مئی ۱۹۴۳ء ہندی میں ’’معارف‘‘ میں شائع کرایا تھا، پڑھوا کر سنا۔ اورآج مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حضرت مولانا کی طرف سے تحریر کروں کہ ’’ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی دعوت کواسلام میں اول درجے کی چیز مانتے ہیں، ان کے بعد امام ولی اللہ کی تحریک کودوسرے درجے کی دعوت کا مقام دیتے ہیں‘‘— آج کل ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اسی کے متعلق ہم نے اطمینان کے ساتھ امام ولی اللہ کی تابعداری میں اپنا پروگرام (Programme) بنا لیا ہے۔ اب ہم اس میں کسی دوسرے پروگرام (Programme) کوتداخل کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ برائے مہربانی ہمیں معاف فرمائیں۔

فقط والسلام

المخلص ، بشیراحمد۔بی۔اے

(معتمد خصوصی حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی)

کتاب اول

سابقہ نام

”شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کی سیاسی تحریک“

استدراک و تنقیح

نیا نام

صادقین صادق پور اور علمائے اہل حدیث

مولانا سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ

صادقین صادق پور اور علمائے اہل حدیث

مولانا سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ

دنیا میں مظلومیتوں کی داستان بار بار دہرائی گئی ہے، تاریخ میں میدان جنگ کے ابتلاء کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں بعض اکابر اُمت کی مظلومیت میدان شہادت کی مظلومیت پر بھی بازی لے گئی ہے۔ اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس خون کی چھینٹیں ان کے ماننے والوں اور نام برداروں کے دامن پر بھی ہیں۔

جہاں تک تاریخی واقعات وحقائق کا تعلق ہے، یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء بمطابق ۱۲۰۱ھ = ۱۸۳۱ء بمطابق ۱۲۴۶ھ) اور ان کے اصحاب سے پہلے اس خطۂ ارض میں کسی صحیح دینی تجدید وانقلاب کے لیے کوئی منظم اور ہمہ گیر کوشش نہیں کی گئی اور ہندوستان تو ہندوستان ساری دنیا میں عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد کوئی جماعت طریق نبوت اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی قریب اور ہم آہنگ نظر نہیں آئی، لیکن حالات اور ماحول کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غیر تو غیر اپنوں میں بھی سید صاحب رحمہ اللہ اور ان کے مخصوص احباب کا فکر بلند، معتدل مزاج ومشرب اور مسلک وعمل میں عجیب وغریب توازن پورے طور پر نہیں سمجھا گیا۔ ہر فریق نے اپنے ظن وتخمین کے مطابق اُنہیں اپنانے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کھینچا تانی میں وہ ''فکر بلند'' تو آنکھوں سے اوجھل

ہو گیا، اور اُن کے ماننے والوں اور پیروی کا دم بھرنے والوں میں تقلید وعدم تقلید، آمین، رفع یدین، دیہاتوں میں نماز جمعہ اور اسی قسم کے چند فروعی مسئلے لڑنے جھگڑنے کے لیے رہ گئے، آغاز کیا تھا، انجام کیا ہوا۔ دیدۂ عبرت وا ہو، تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری بدبختی یہیں ختم نہیں ہوتی، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی[۱] (ف ۱۸۷۲ء بمطابق ۱۲۹۸ھ) سے لے کر ولیم ولسن ہنٹر[۲] (W.W. HUNTER) راونشا[۳]

---

(۱) مولوی فضل رسول صاحب نے ہندوستان میں سب سے پہلے وہابی کی اصطلاح استعمال کی (ترجمان وہابیہ ص ۸۸ رسالہ اشاعۃ السنۃ ۱۳۰۰ھ ص ۲۱۲) نجد و ہندوستان کے موحدین ومجاہدین پر رنگ برنگ کے الزامات دھرنے میں یہ پیش پیش رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ (کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت مولانا آزاد رحمہ اللہ زندہ تھے۔ ناشر) کے ''تذکرہ'' میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ طریقے پر آیا ہے، چند سطریں نذر ناظرین ہیں۔ ''مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمن میں لکھتے ہیں: ''داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا، اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا، جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا اور ابن قیم کا شاگرد ''شقی'' ابن تیمیہ، ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا'' ''بعض اشرار بداطوار جہلہ فسقہ درحلقہ انقیادش آمدہ در بلاد اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند۔'' اور ان تمام مؤرخانہ تحقیقات کے لیے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ الخ الخ (تذکرہ ص: ۲۶۶) [ص: ی] ''سوط الرحمن'' کا اصل نام ''الھوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیۃ'' ہے، ۱۲۶۵ھ میں طبع ہوئی ہے۔ مولانا آزاد رحمہ اللہ نے جو اقتباس دیا ہے وہ دراصل مسلسل مصنف کی عبارت نہیں ہے بلکہ یہ کتاب مذکور کے ص: ۲۳، ص: ۲۵ پر ائمہ مذکورین کے خلاف یہ دریدہ دہنی کی گئی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ] (ناشر: سابقہ ایڈیشن، دارالدعوۃ السّلفیہ، لاہور)

(۲) ہنٹر صاحب جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما ہیں، ان کی کتاب مسلمانان ہند (Our Indian Musalmans) مشہور ہے، مولوی طفیل احمد صاحب کی کتابوں (حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اس کے کافی اقتباسات ہیں۔

(۳) راونشا ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ پٹنہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا، مولانا احمد اللہ صادقپوری (ف ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء) کے مقدمے کی ابتدائی سماعت اسی نے کی تھی۔ اس کا فیصلہ اور میمورنڈم ہفوات و خرافات کا مجموعہ ہے۔ ہنٹر کی کتاب کا ایک حصہ اسی میمورنڈم سے ماخوذ ہے۔

(JAMES OKINLEY)(۱)(T.E.RAVENSHAW) اور جیمس او کنلے
تک کی دشنام طرازیاں برداشت کی جاسکتی ہیں، کہ ان سے کلمۂ خیر کی توقع ہی کب تھی؟ مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں۔ ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں۔ ان کے ضرب المثل اخلاص پر شک کریں تو پھر خواہ مخواہ صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی، کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے۔ عرض مدعا سے روکتا ہے، دوسری طرف احساس فرض اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی، تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزشیں آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بن جائیں، اظہار مطلب پر اُکساتا ہے، یوں تو مروت اور صداقت کی کشمکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کی ہے۔ لیکن راقم کے لیے اس تحریر کے سلسلے میں یہ کشمکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی، آخر دو تین مہینوں کی ذہنی اُلجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہار مطلب ہی کے حق میں فیصلہ دیا اور زبان قلم نے بسم اللہ کہہ کر استدراک کی بسم اللہ کی۔

جناب مولانا عبیداللہ سندھی کی زیر نظر کتاب ''شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک'' ''حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ'' کا مقدمہ ہے۔ اصل مقدمہ کے آغاز سے پہلے ''اجمالی فہرست'' مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس کا لب لباب اصل کے جملوں کو مقدور بھر محفوظ رکھتے ہوئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ تفصیل میں پڑنے سے پہلے مقدمہ کا اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔

---

(۱) او کنلے صاحب بھی مجاہدین کے پرانے مشفق ہیں۔ سازش کے آخری مقدمے (۱۸۷۰ء مقدمہ پٹنہ بنام امیر خان، حشم داد خاں، ابراہیم منڈل وغیرہم) میں یہ سرکار کی طرف سے پیروکار تھے، بلاکشانِ الم کی پریشانیوں میں ان کا بھی کافی دخل رہا ہے۔

مولانا سندھی کے مفروضات کا خلاصہ اور خاکہ:

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ (۵/مئی ۱۷۳۱ء[1]) سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لیے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلاب فرانس سے ۵۸/سال پہلے ہو گزرا ہے۔

حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا۔ جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں، اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس نے حکومت موقتہ (Provisional Government) بنائی، لیکن ۲۷/ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ[2] (۶ مئی/۱۸۳۱ء) (بروز جمعہ) بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس صدی میں اس تحریک کے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

(الف) امام ولی اللہ دہلوی ۱۷۳۱-۱۷۶۳ء۔

(ب) امام عبد العزیز دہلوی ۱۷۶۳ء-۱۸۲۴ء۔

(ج) امام محمد اسحاق دہلوی ۱۸۲۶ء-۱۸۴۶ء۔

(د) حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء-۱۸۳۱ء۔

یہ تحریک کا پہلا دور تھا۔

---

(۱) ۲۱ ذوالقعدہ، ۱۱۴۴ھ، ۵ مئی ۱۷۳۲ء کے مطابق ہوتی ہے۔ ۱۷۳۱ء صحیح نہیں۔

(۲) ۶/مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ ہے نہ کہ ۲۷ ذوالقعدہ، ۹ مئی دوشنبہ ہوگی۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ سید صاحب کی شہادت ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی ہے۔ (سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ صفحہ ۲۲۶، ج:۱)

دوسرا دور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظّمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی، ان کے بعد الامیر امداداللہ بارہ برس دہلی میں رہے۔ یعنی ۱۸۵۸ء تک، اس کے بعد مکہ معظّمہ میں۔

ان کے پہلے نائب یعنی مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک۔ پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۹۲۰ء(۱) تک، اس سال تحریک کا دوسرا دور ختم ہوا، تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔ (ص ۹-۱۰)

مذکورہ مفروضوں کا اجمالی تجزیہ

یہ ہے حزب ولی اللہ کی اجمالی تاریخ کے مقدمہ کا خاکہ، جس میں حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کو بالکل ضمنی حیثیت دی گئی ہے۔ اوران کے خاص ماننے والوں اور سالہا سال تک علم جہاد بلند کرنے والوں کے لیے تو اس خاکے میں کوئی گنجائش ہی نہیں، اسلامی ہند کی پہلی اور (اب تک) آخری تحریک تجدید وانقلاب میں سید صاحب رحمہ اللہ کو ضمنی حیثیت دینا، حقیقت وصداقت کا خون کرنا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی نے اس باب میں سید شہید رحمہ اللہ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے۔ اور پھر امیر شہید رحمہ اللہ (مولانا کی اصطلاح کے مطابق) کی اس ''ضمنی حیثیت'' کو بجا ثابت کرنے کے لیے اُن کی طرف طرح طرح کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ اوراسی پر بس نہیں، تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحق سے مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ تک مختلف افراد کی مسلسل امارت وامامت ثابت کرنے کے لیے سید شہید رحمہ اللہ کے جان نثاروں، پورب کے سرفروش مجاہدوں اور

---

(۱) اس فہرست میں صرف عیسوی سنہ (سنین) دیے گئے ہیں۔

شہیدوں، سرکار انگریزی کے ممنون التفات اہل صادق پور، (۱) بدنام وہابیوں اور عام جماعت اہل حدیث کو زیدیت، شیعیت، رفض اور مختلف القاب سے اس بے دردی کے ساتھ نوازا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وسیع النظر عالم اور ممتاز صاحب فکر کے قلم سے ایسی لغزش کیوں کر ہوئی؟ اور اسی لپیٹ میں یمن کے سلفی عالم و محدث قاضی محمد بن علی شوکانی (ف: ۱۲۵۰ھ - ۱۸۳۴ء) اور نجد کے مظلوم مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف: ۱۲۰۶ھ - ۱۷۹۲ء) اور ان کے متبعین بھی آ گئے ہیں، زیر تحریر استدراک کا مقصد انہی مظالم کا مداوا کرنا ہے۔

حکمت ولی اللہی کی خودساختہ تشریح

یوں تو راقم کو حزب ولی اللہی کی نئی تفسیر و تشریح سے بھی اتفاق نہیں، کتاب وسنت کے

---

(۱) صادق پور، شہر عظیم آباد پٹنہ کا ایک محلہ ہے، یہاں کا ایک ہاشمی خاندان عرصۂ دراز سے علم و فضل میں ممتاز رہا ہے۔ حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ نے جب علم جہاد بلند کیا تو اس خاندان کے ایک ممتاز فرد مولانا ولایت علی (ف: ۱۲۶۹ھ = ۱۸۵۲ء) لبیک کہنے والوں کی صف اول میں تھے اور پھر ان کی تبلیغ سے پورا خاندان سید صاحب رحمہ اللہ اور ان کی دعوت کا علم بردار ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب رحمہ اللہ کی شہادت (۱۲۴۶ھ، ۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۷۱ء تک حکومت کی دارو گیر کے باوجود مسلسل چالیس سال تک صادق پور والوں نے جہاد کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ پھانسی، جلاوطنی، حبس دوام، ضبطی اور ہر قسم کی ممکن اذیتیں انہیں دی گئیں، لیکن یہ اللہ کے بندے راہ حق سے نہ ہٹے، بڑی درد انگیز اور ولولہ خیز داستان ہے، کبھی اطمینان سے سنائی جائے گی۔ سیرت سید احمد شہید (ص: ۲۷۲، ۳۰۵ طبع دوم) کے چوتھے باب میں بھی اس جماعت کی مختصر سرگذشت آ گئی ہے، خاندانی حالات کے لیے مولانا عبدالرحیم صادق پوری اسیر پورٹ بلیر و متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء (ف: ۱۳۴۱ھ، ۱۹۲۳ء) کی ''تذکرۂ صادقہ'' ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جماعت کے کاموں کے متعلق بھی اس میں بکھرے ہوئے لیکن قیمتی معلومات ملتے ہیں۔

علاوہ کسی امام یا حکیم کے مرتب کردہ فلسفہ وحکمت کو دعوت کی اساس بنانا اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں۔ خواہ اس مخصوص فلسفہ وحکمت کے اجزائے ترکیبی تعلیمات ربانی ہی سے کیوں نہ ماخوذ ہوں؟ تجدید کا بلاواسطہ صرف قرآن کریم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہونا چاہیے۔ ورنہ اشخاص وافراد کے نام پر جو تحریک بھی اٹھائی جائے گی اس کا کتاب وسنت کے صراط مستقیم سے ہٹ جانا ضروری ہے۔ اور اگر وہ تحریک اس گھاٹی سے بھی صحیح وسالم بچ نکلی تو کم سے کم ایک نئے فرقے کا ظہور یقینی ہے۔ جو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل فتنہ ہے۔

اکبر کے ''دین الٰہی'' اور ''نیشنلزم'' کی حمایت

یہ تو ایک اصولی بات تھی ورنہ مولانا سندھی کی تفسیر کے مطابق حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللہی کے خمیر میں وقت کی بعض مقبول لیکن بر خود غلط تحریکوں کے جراثیم صاف نظر آتے ہیں، اکبر کے رسوائے عالم ''دین الٰہی'' کی مدح سرائی [۱] (۵-۱۰۴) اور ابلیس کی بیٹی ''نیشنلزم'' کا رجز میخانۂ مغرب کا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ الہند کا

---

(۱) اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، حکومت چلانے کے لیے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرز عمل ہوگا اس کے لیے اکبر نے ''دین الٰہی'' کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرف دار نہیں ہوں گے مگر مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے کو آزاد نہیں کریں گے۔ اور لادینیت نہیں آنے پائے گی (ص ۱۰۴) کیا دین الٰہی کے متعلق یہ بیان تاریخی طور پر صحیح ہے! مزید تفسیر ملاحظہ ہو۔

''ہماری رائے میں اکبر نے جو کام شروع کیا تھا وہ اساساً صحیح تھا اور عملاً غلطیاں اس لیے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لیے آدمی میسر نہیں آتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتیں اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعے پوری کر دیں۔ شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا جو اکبر نے شروع کیا تھا کیوں کہ وہ بھی اسلام کو انسانیت کی تفسیر بتاتے ہیں آپ تمام ادیان کو منطبق کر سکتے ہیں، ان کے طریقے پر ایک مسلم عالم اس نظام سلطنت کو چلا سکتا ہے جو اکبر کا مقصد تھا۔'' الخ الخ (ص ۱۰۵)

کیا اس کے بعد کسی رائے زنی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

شاگرد ہندوستان چھوڑتے وقت تو اتحاد اسلامی کا حامی تھا اور واپسی کے بعد وہ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر کرتا ہے۔

''جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحاد اسلامی کے حامی تھے۔ یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے تھے مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ ہیں، یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا۔'' (ص۱۶۶)

اللہ رے! انقلاب حال!! امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا شارح ومبلغ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

اس جملہ معترضہ سے یہ حقیقت ظاہر کرنا تھا کہ گو اس ''استدراک'' میں ہمارا روئے سخن زیادہ تر ان غلط بیانیوں کی طرف رہے گا جو حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ ان کے متبعین اور نجد و یمن کے دوسرے اکابر امت کے متعلق کی گئی ہیں۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکمت ولی اللہ کی اس تشریح وتفسیر سے بھی ہمیں اتفاق ہے جس کی تبلیغ اس کتاب میں کی گئی ہے اور جس میں روس اور ترکی کے نمونے پر ایک نظام عمل ''شاہ صاحب کا اجمالی پروگرام'' کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ (ص: ۳۰-۳۵)

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی تھی

مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حزب ولی اللہ کے تین امام ظاہر ہوئے۔ ایک امارت منعقد ہوئی۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ کو وہ ائمہ میں شمار کرتے ہیں اور حضرت سید احمد شہید کو حکومت موقتہ کے امیر کا درجہ دیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ واقعات اس بیان کا ساتھ نہیں دیتے۔ پہلے تو یہ بسم اللہ ہی محل نظر ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے کوئی سیاسی پارٹی بنائی تھی۔ تصنیفات میں وقت کے حالات اور ملکی

مصالح کے متعلق اشارات کا ملنا اور بات ہے اور کسی سیاسی پارٹی کی تشکیل بالکل دوسری چیز ہے، جہاں تک پتہ چلتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اصلاح وتجدیدیت کی نشان دہی اور صرف فکری تشکیل کی تھی، ان کے بنائے ہوئے خاکہ کی تکمیل عملی جدوجہداور سرفروشانہ اقدام کا رتبہ بلند تکیہ رائے بریلی کے سیدزادے اور خود ان کے پوتے کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔(اللہ بالاکوٹ کی سرزمین پر اپنی رحمت کے پھول برسائے کہ وہاں ناموس ملت خواب میں ہے۔) بہرحال اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مولانا کی ہمنوائی میں حزب ولی اللہ کی تشکیل اور اس کی تمام تفصیلات کو تسلیم کرلیں تو ہمیں پچھلی ڈیڑھ صدی کی تاریخ ازسرنو لکھنا پڑے گی۔اس لیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کی امامت اور مرکزی حیثیت قبول کرنے میں تو کوئی دقت نہیں۔لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کو حزب کا امام اور سید شہید رحمہ اللہ کو ان کا ماتحت اور امیر بنا کر پیش کرنا حق وصداقت سے ٹکر لینا ہے۔تاریخ جب آپ کے منشا کے مطابق نہیں بنی تو اب تاریخی حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے خیالات کے تابع بنانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اور مولانا سندھی کی یہی بنیادی مسامحت ہے جس نے اس ''تاریخی مقدمہ'' کو مفروضات اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔

(۱)

سید احمد شہید رحمہ اللہ کے متعلق مغالطات کا ازالہ

اب آیئے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں۔ فاضل مصنف نے حضرت سید شہید رحمہ اللہ کی امامت وامارت پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے پہلے مصنف کے اعتراف فضل کی طرف بھی اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان کے مقاصد سے تعارض نہیں ہوتا، وہ سید شہید کے کمالات کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔

''حضرت سید احمد بریلوی جوان کے مدرسے کے شاگرد تھے، مگر قوت کشفی میں اپنے زمانے کے عارفین بلکہ بہت سے متقدمین پر بھی سبقت لے گئے تھے۔ ان کی تربیت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی صحبت میں مکمل ہوئی۔'' (ص: ۷۴)

یہاں عاجز صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سید صاحب کو اس گھر سے صرف تلمذ ہی نہ تھا بلکہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت بھی حاصل تھی۔

(سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ، طبع دوم، ص: ۵۵)

اب اس اعتراف کے بعد ''مدح وذم'' کی آمیزش ملاحظہ ہو:

''شاہ عبدالعزیز کا پروگرام ہی تھا کہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلایا جائے۔..... اس کے لیے وہاں ایک امارت قائم کرنے کی ضرورت ہوگی اور افغانوں میں ایک سید کی امارت بہت جلد مقبول ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے سید صاحب کو امیر مقرر کیا گیا۔ اور مولانا شہید اور مولانا عبدالحی کو ان کا وزیر بنا کر ساتھ کردیا گیا۔'' (ص: ۷۵)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "سید زادگی" کے سوا سید صاحب رحمہ اللہ میں اور کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر اس پر بھی مولانا کو اطمینان نہیں، دنیا تو یہی جانتی ہے کہ پنجاب و سرحد میں احیائے جہاد کی ساری کوششیں سید صاحب ہی کی دعوت اور جد و جہد کا نتیجہ تھیں، اس سے آگے بڑھ کر ذرا صاف الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"سید صاحب اور مولانا شہید اور مولانا عبدالحی اس انقلابی پروپیگنڈے کے مرکز بنائے گئے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحٰق کو اپنی جگہ مقرر کیا، ہماری سمجھ میں اس نئے حزب کے امیر شاہ اسحٰق تھے۔ سید صاحب فقط امیر الدعوۃ والجہاد تھے، اور یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے کھڑی ہو رہی ہے۔ اس کو ایک حکومت موقتہ کا درجہ دینا چاہیے۔" (ص: ۷۵)

غلطی ہائے مضامین

ان تین سطروں میں متعدد ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔

(الف) شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحٰق کو کب مقرر کیا؟ یہ بیان محتاج ثبوت ہے اور اس کے لیے مستند تاریخی شہادت کی ضرورت ہے۔

(ب) سید صاحب رحمہ اللہ کو فقط امیر الدعوۃ والجہاد کہنا بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سید صاحب رحمہ اللہ اور اُن کے رفقاء کر رہے تھے، جن میں مولانا عبدالحی اور مولانا شہید رحمہما اللہ "شیخین" کا درجہ رکھتے ہیں اور فوری طور پر ان کے سامنے اصلاح رسوم و بدعات کے علاوہ پنجاب میں سکھوں سے جہاد کرنا تھا، گو ان کے مقاصد بہت بلند تھے۔

(ج) یہ کہنا کہ "یہ جماعت سلطنت دہلی کی کمزوری دور کرنے کے لیے کھڑی ہو رہی

ہے۔'' سید صاب رحمہ اللہ اوران کے اعلیٰ مقاصد کی تنقیص ہے۔ سید صاحب خالص اسلامی نظام چاہتے تھے، خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس ان کا مقصد تھا۔ دہلی کی سلطنت کبھی اسلامی سلطنت نہیں رہی۔ سید صاحب رحمہ اللہ کا نصب العین اور مقصد اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں، جہاد کا ارادہ بھی کسی حزب کی تاسیس وتشکیل سے شروع نہیں ہوا۔ رامپور میں ولایتیوں سے مسلمانان پنجاب کی دردانگیز حالت سنی اور نیت اسی وقت مستحکم ہوگئی (سوانح احمدی ص ۲۴) رہا جہاد وہجرت اور نصب امامت کا مقصد عالی تو اسے خود اُنہی کی زبان سے سنئے، سردار سلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:

رب غیور کہ علیم بذات الصدور است آگاہ است برایں معنی کہ ایں جانب را از قبول ایں منصب غیر از اقامت جہاد بروجہ مشروع وحصول معنی انتظام در عساکر اہل اسلام غرض دیگر از اغراض نفسانیہ نیست.... آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطار عالم احکام رب العالمین کہ مسمی بشرع متیں است بلا منازعت احدے نافذ گردد...۔[1]

(سیرت سید احمد شہید، ص ۱۱۰-۱۱۱)

''رب غیور جو کہ دل کے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے، اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ میری اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا

(۱) سید صاحب رحمہ اللہ اور مولانا شہید کے خطوط میں اس قسم کے بیانات اتنے واضح اور بے لاگ طریقے پر ہیں کہ ان میں کسی چوں وچرا کی گنجائش ہی نہیں ہے، ان خطوط کا ایک معتدبہ حصہ سوانح احمدی کے آخر میں موجود ہے (ص ۲۴۲-۱۶۹) ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ مکاتیب کا اچھا خاصہ قیمتی ذخیرہ بھی محفوظ ہے، جن سے سیرت سید احمد شہید کے لائق مصنف نے فائدہ اٹھایا ہے (ص ۷) مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو مزید اقتباسات دیے جاتے۔ ان بزرگوں کے بلند مقصد اور اسلامی روح کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ان دو خطوں کا مطالعہ کافی ہوگا جو سیرت سید احمد شہید کے (ص ۷۰-۱۵۹) میں درج کیے گئے ہیں۔

کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاں کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو... ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں...۔"

ہمیں کوئی بتائے کہ دہلی کی حکومت کو کسی دور میں اس مقصد عالی سے کوئی دور کا تعلق بھی رہا ہے؟

لشتان مابین الیزیدین فی الندیٰ
یزید سلیم والاغربن حاتم

سید صاحب رحمہ اللہ کو ایک ضمنی حیثیت دے دینا تو آسان ہے، لیکن واقعات کی تکذیب بہت مشکل ہے۔ شاہ عبد العزیز صاحب کے داماد مولانا عبد الحی بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) اور بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ (ش ۱۲۴۶ھ-۱۸۳۱ء) جن میں سے ہر ایک کا مرتبہ خاندان ولی اللّٰہی میں مسلم ہے، سید صاحب کے جان نثاروں میں شامل تھے، خدام کی طرح ان کی رکاب تھامے پھرتے تھے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۳۰۵-۳۱۵) اور اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے سلسلے اور خاندان میں ان دو بزرگوں کا مرتبہ مولانا شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے، (سیرت سید احمد ص: ۳۱۵) اس کی پیش بندی مولانا کس طرح فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"... مگر اس امارت کو تھامنے کے لیے جس قدر تعلق شاہ ولی اللہ کی تحریک اور پھر شاہ عبد العزیز کے کام سے تاریخی طور پر ہونا چاہیے، اس سے سید صاحب کوئی تعلق نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ ایک نئی تحریک شروع کر دیں..... اس نقص کے جبر کے لیے مولانا عبد الحی اور مولانا شہید ان کے ساتھ لگا دیے گئے۔" (ص ۶۷)

اس بیان سے ''معاذ اللہ'' یہ شبہ ہوتا ہے کہ شیخین کے ذمہ جاسوسی کی خدمت سپرد کی گئی تھی، کہاں کی بات کہاں پہنچتی ہے؟

اس جبر نقص کی مزید تشریح مولانا کے شاگرد اور اس کتاب کے مرتب و شارح [1] مولوی نورالحق صاحب علوی کی زبان سے سنیے:

''امیر شہید دراصل اس حزب سے نہیں بلکہ بعد میں منضم کیے گئے، ان میں کشفی کمالات تھے، سپاہ گری کی تعلیم تھی، سید تھے، اس لیے ان کو امام عبد العزیز رحمہ اللہ نے امارت جہاد کے لیے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حزب مذکور کی راہ سے نہ ہٹ جائیں، ان کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیے۔ مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ اسحاق کو مقرر کیا۔'' (ص ۱۴۳)

آپ سمجھے یہ ''نئی تحریک'' کیا چیز ہے؟ اور ''حزب مذکور کی راہ سے ہٹنا'' کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کی تفسیر خود مولانا کی زبان سے سننے کے لائق ہے۔

''اس طرح اس خاندان میں (یعنی حضرت سید شہید کے خاندان میں) حضرت مجدد سرہندی رحمہ اللہ اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہوگئیں۔ یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوری رحمہ اللہ سے متوارث چلی آتی ہے۔ بنابریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور پر رنگ جانا بعید ہے۔ [2] یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موقع ملا تو انہوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا اور تحریک ناکام رہ گئی۔''

اچھا صاحب! سید صاحب نے موقع ملتے ہی ''نئی تحریک'' کھڑی کر دی اور اپنے

---

(۱) یہ کتاب اصل میں مولانا سندھی نے املاء کرائی ہے اور علوی صاحب نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اسے مرتب کیا ہے اور ساتھ ساتھ تشریحی حاشیئے بڑھا دیے ہیں۔ (دیباچۂ کتاب)

(۲) خط کشیدہ فقروں کے علاوہ ان سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی صحت سے ہمیں انکار نہیں۔

امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا۔لیکن امام عبد العزیز کے مقرر کردہ اور ''مکمل تربیت یافتہ'' وزیروں (مولانا عبد الحی اور مولانا شہید رحمہا اللہ) کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بھی بیعت کر لی، اور صرف بیعت ہی نہیں کی، بلکہ اس کے انعقاد اور تبلیغ میں اپنے شایان شان نمایاں حصہ بھی لیا۔(ملاحظہ ہو، مولانا شہید رحمہ اللہ کا مکتوب مندرجہ سیرت سید شہید رحمہ اللہ ص ۱۶۱-۱۶۹)

علاوہ بریں مولانا کے بیان کے مطابق امام عبد العزیز رحمہ اللہ نے 'جمعیۃ مرکزیہ'' کی مدد سے جو''نوجوان'' تیار کیے ان میں ''سرکردہ'' تین یا چار بزرگ تھے۔(۱) مولانا محمد اسمٰعیل شہید۔(۲) مولانا عبد الحی دہلوی۔(۳) مولانا محمد اسحاق۔(۴) مولانا محمد یعقوب رحمہم اللہ (ص ۱۱۴) اور یہ معلوم ہے کہ انعقاد بیعت کے اجتماع میں اس ''سرکردہ جماعت'' کے دو زیادہ ممتاز رکن شریک تھے۔(یعنی مولانا عبد الحی اور مولانا شہید رحمہا اللہ) اور جب اس کی خبر مولانا اسحاق اور مولانا یعقوب کو ملی، تو وہ معترض نہیں ہوئے، بلکہ برابر ''اموال و رجال'' سے امداد میں سرگرم رہے۔اس طرح پر ''جمعیۃ مرکزیہ'' کی تربت یافتہ ''سرکردہ جماعت'' کا سید صاحب رحمہ اللہ کی امامت پر اجماع ثابت ہوتا ہے جس سے کوئی غیر جانبدار انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

رہی ''تحریک کی ناکامی'' سو اس کے دوسرے اسباب ہیں۔جن میں سرداران پشاور کی غداری اور سنگ دلی زیادہ اہم ہے۔[1] خود مولانا بھی اجماع کو تسلیم کرتے ہیں۔اور ساتھ ساتھ اسے ''اختلافات کا منبع'' بھی بتاتے جاتے ہیں:

> ''۱۲۳۹ھ میں شاہ عبد العزیز کا انتقال ہوا۔اسی سال سید صاحب اور ان کے رفقاء (مولانا اسمٰعیل و مولانا عبد الحی وغیرہ) نے ہجرت کا ارادہ کیا۔

---

(۱) ناکامی کے اسباب کو ہم یہاں نہیں چھیڑنا چاہتے ورنہ مضمون تبصرہ کی حد سے نکل کر ایک رسالہ کی شکل اختیار کر لے گا۔سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے مقالے میں ناکامی کے اسباب پر مختصر لیکن اچھی تحقیقی بحث کی ہے، اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔(الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اول ص ۹۳-۹۸)

۱۲۴۲ھ میں سید صاحب کی امامت پر اجماع منعقد ہوا، اور وہی اختلاف کا منبع بن گیا۔'' (ص ۱۱۶)

دوسری جگہ اس ''بیعت امامت'' کو ان لوگوں کی ''مداخلت'' کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے۔

''یہاں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ صاحب کے فیصلے یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجے پر مان لیا گیا اور یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا۔ جو امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ اس شکست میں اس اصولی تبدیلی کو بڑا دخل ہے۔'' (ص ۱۵۲)

خیر شکست کے اسباب تو دوسرے ہیں، یہاں ہمیں صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ حزب ولی اللہ کے خاص ارکان اور امام عبدالعزیز کے ''تربیت کردہ اصحاب'' اور سید صاحب کی جماعت میں شیخین کا رتبہ رکھنے والے بزرگوں (مولانا عبدالحی اور مولانا شہید رحمہا اللہ) کی موجودگی میں دوسرے لوگوں کو ''مداخلت'' کا موقع کس طرح مل گیا؟ اور پھر صرف ان ''وزیروں پر'' بس نہیں ان ''ولی اللّٰہیوں'' نے بھی سید شہید کے ہاتھ پر بیعت کی جو میدان جہاد سے دور ہندوستان میں تھے، خود مولانا کا بیان ہے:

واستخلفه الامام عبد العزیز (۱۲۳۱ھ-۱۸۱۶ء) لامامته الدعوة إلى اتباع السنة والجهاد وجعل معه من العلماء مولانا عبدالحی الصدر السعید و مولانا اسمٰعیل الصدر الشهید کالوزیر ین و کان امرهم بالشوریٰ بینهم واذا اتفق الثلٰثة علیٰ شئی یکون مثل حکم الامام عبدالعزیز. (ص ۱۴۷)

''امام عبدالعزیز نے (۱۲۳۱ھ-۱۸۱۶ء) میں سید صاحب کو اتباع سنت اور

دعوت جہاد کی سر براہی (امامت) کے لیے اپنا جانشین بنایا اور علماء میں سے صدر حمید مولانا عبدالحی اور صدر شہید مولانا اسمٰعیل رحمہ اللہ کو وزیر کے طور پر ان کے ساتھ کر دیا۔ تمام اہم امور ان کے درمیان شوریٰ سے طے ہوتے تھے، اس طرح پر کہ اگر تینوں کسی بات پر متفق ہو جاتے تو وہ امام عبدالعزیز کا فیصلہ سمجھا جاتا۔''

یہاں مولانا سندھی سے یہ خادم دریافت کرسکتا ہے کہ جب سید شہید کی بیعت امامت پر ان تینوں صاحبوں کا (''الثلثة'' بہ شمول سید صاحب) اتفاق ہو گیا تھا تو پھر اسے امام عبدالعزیز کا فیصلہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ ابھی سلسلہ بیان جاری ہے:

واقاموا حکومة موقتة کان أمینها السید احمد فی ۱۲/جمادی الآخرة ۱۲۴۲ھ (۱۰/[1] نوفمبر ۱۸۲۷ء) وبایع الأفاغنة اکثرهم بامامة الامیر... وکذلك بایع امامة الامیر من کان من الولی اللّٰهیین بالهند وکانوا یمدونهم بالاموال والرجال. (ص ۱۴۸ بحواله کتاب التمهید)

''اور ان لوگوں نے ۱۲/ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ (۱۰/ نومبر ۱۸۲۷ء) کو ایک حکومت موقتہ قائم کر لی جس کے امیر سید احمد تھے۔ اور اکثر افاغنہ نے امیر کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی نیز امیر کی امامت کی بیعت ان ولی اللّٰہیوں نے بھی کی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے اور وہ مجاہدین کی آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہتے تھے۔'' (ص ۱۴۸)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید شہید رحمہ اللہ کی امامت پر وقت کے تمام ولی

---

(۱) ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۱/ جنوری ۱۸۲۷ء ہوتی ہے، دوسری جگہ اسی کتاب میں (ص ۱۵۶) تقریباً صحیح تاریخ دی گئی ہے۔ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) قمری مہینوں کی مطابقت میں ایک دن کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت انجمن ترقی اردو دہلی کی مرتب کردہ جنتری (تقویم ہجری وعیسوی) ہے۔

اللہیوں کا اتفاق ہو گیا تھا، اور خود مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب بھی یقینی ان میں شریک ہوں گے۔آخر وہ ولی اللہیوں سے خارج تو تھے نہیں لیکن مولانا کو تو اپنا ''نظریہ'' پیش کرنا ہے۔ خواہ واقعات سے تائید نہ ہوتی ہو۔اس لیے کتاب التمہید کے اس بے لاگ بیان کے ساتھ چند فقرے اپنے مطلب کے بھی چسپاں کیے گئے۔

وهذا الامر كان مركز ادارتة الدهلى (كذا) وكان الصدر الحميد مولانا محمد اسحاق مديرا.(ص:۱۴۸)

''اس کا مرکزی دفتر دہلی تھا۔اور مولانا محمد اسحاق اس کے ڈائرکٹر تھے۔''

اصل میں "هذا الامر" کا فقرہ ہے۔اس سے اگر مراد امامت اور نصب امارت کی قوت ''یا قیادت علیا'' مراد ہے، تو وہ دہلی میں کیسے ہو سکتی ہے؟ امیر منتخب میدان جہاد میں موجود ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے خواص وعوام کے ساتھ عبدالعزیز کے مقرر کردہ وزیر بھی ہیں، انہی تینوں بزرگوں کا نام مولانا نے ''بورڈ'' رکھا ہے۔اس کے بعد دہلی یا میدان جہاد سے دور رہنے والے بزرگ صرف آدمی اور روپے (الاموال والرجال) مدد کر سکتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شاہ محمد اسحاق اس میں سرگرم تھے اور ہو سکتا ہے کہ اس تنظیم کا بار ان ہی کے کندھے پر ہو۔[1]

اس حقیقت کو مولانا نے خود بھی ایک دوسری جگہ صاف طور پر بیان کیا ہے۔عربی دنیا سے اسلامی ہند کی اسلامی تحریک، کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

النهضة التى قام بها الامام عبدالعزيز الدهلوى ارتقت من سنة ۱۲۴۳ھ إلى الحكومة الموقتة الهندية

---

(۱) مولانا نے بار بار زور دیا ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے ہاتھ میں روپے روانہ کرنے کا انتظام تھا۔ (ص ۳۔۱۱۲) ہمیں اس کے ماننے میں ادنیٰ تامل نہیں، اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شاہ محمد اسحٰق جماعت مجاہدین اور ان کے امیر کے اعانت میں سرگرم تھے۔رہا یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا محمد اسحٰق ہی جز وکل تھے۔اور سید شہید رحمہ اللہ ان کے کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں۔

فی جبال الافغانیین من حدود الھند و رئیس تلك الحکومة الشرعیة کان امیر المؤمنین السید أحمد الدھلوی[1] (؟) (الامیر الشھید) وصدارة و زراتھا تسند إلیٰ مولانا عبد الحی الدھلوی(؟) (الصدر السعید) والا مور الحربیة و السیاسیة کانت مو کولة إلی مولانا محمد اسماعیل الدھلوی (الصدر الشھید) و أما الامور التی تشبه الداخلیة من جمع الاموال و حشد الرجال و غیرھما فکان و کیلھا فی الدھلی (کذا) مولانا محمد اسحاق (الصدر الحمید).

(ص ۱۷۳-۱۷۵ / بحوالہ مقدمہ المسوی مطبوعہ مکہ مکرمہ)

''امام عبدالعزیز کے ہاتھوں جو تحریک اٹھی وہ آگے چل کر (۱۲۴۳ھ) سے سرحدی علاقوں میں ایک حکومت موقتہ ہندیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی اس شرعی حکومت کے صدر امیر المومنین سید احمد دہلوی (؟ بریلوی) (امیر شہید) تھے، اور صدارت عظمیٰ کا منصب مولانا عبدالحی دہلوی (؟ بڈھانوی) (صدر سعید) کے سپرد تھا اور امور حربیہ و سیاسیہ کی سربراہی مولانا محمد اسماعیل دہلوی (صدر شہید) کے ذمہ تھی، باقی رہے۔ وہ امور جو وزارت داخلیہ کے منصب سے مشابہ ہیں، جیسے آدمی اور روپے کی فراہمی وغیرہ تو ان کے وکیل دہلی میں مولانا محمد اسحق (صدر حمید) تھے۔''

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کا یہ بیان اس باب میں فیصلہ کن ہے، رئیس حکومت وکیل

(۱) پتہ نہیں، سید شہید رحمہ اللہ کو دہلوی کس طرح لکھ دیا گیا؟ ممکن ہے کتابت یا طباعت کی غلطی ہو۔ مولانا عبد الحی بڈھانوی کو شاید قرابت کے باعث دہلوی لکھا گیا ہو۔

داخلیہ کے مراتب میں جو فرق ہے وہی سید شہید رحمہ اللہ اور مولانا شاہ محمد اسحٰق کے درمیان ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور یہ ان بزرگوں کے باہمی ''فرق مراتب'' کے متعلق عرض کیا جا رہا ہے ورنہ ہمارے لیے سب لائق احترام و عقیدت ہیں ؎

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ ہمہ آفتاب است

اور حاشا کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی کسی کے ساتھ سوء ادب کا ادنیٰ شائبہ آیا ہو۔

اعاذنا اللہ من ذلك و کفیٰ به علیما.

سید شہید رحمہ اللہ اور مولانا محمد اسحٰق کے درمیان کیا فرق مراتب تھا۔ اور یہ کہ شاہ اسحٰق صاحب سید صاحب رحمہ اللہ کی مالی امداد میں کس قدر سرگرم تھے، اس کا اندازہ خود حضرت سید شہید کے ایک مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو میدان جہاد سے مولانا محمد اسحٰق کے نام تحریر کیا گیا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم، از امیر المؤمنین سید احمد بخدمت بابرکت صاحبزادۂ والا تبار مولانا محمد اسحٰق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ بتاریخ وہم ماہ رمضان ہنڈوی مبلغ ہفت ہزار صد و پنجاہ روپیہ رسید، لیکن بجز پرچہ کاغذ یک خرمہرہ ہم نہ رسید، موجبش دریافت نیست، لازم کہ سبب تعویق آں برآں برنگارند۔ زیادہ السلام مع الاکرام۔ (سوانح احمدی ص ۲۳۵)

کیا سید صاحب رحمہ اللہ کے مرتبے کا آدمی جو اعلیٰ ''کشفی قوت'' کا حامل ہو، اپنے مطاع اور سردار کو صاحبزادہ والا تبار سے خطاب کر سکتا ہے؟

''کمپنی بہادر'' سے ساز باز کا الزام

اب ہم انتہائی رنج و قلق کے ساتھ مولانا سندھی کی کتاب سے ایک ایسا اقتباس پیش

کرتے ہیں جس میں انہوں نے دوسری باتوں کے علاوہ سید صاحب رحمہ اللہ اوران کے خاص ماننے والوں پر کمپنی بہادر سے سازباز کا الزام لگایا ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ہاں! تو مولانا فرماتے ہیں:

”...لہٰذا سید صاحب رحمہ اللہ اوران کے مجاہدین کو دلّی کے مرکز کے تابع ہوکر کام کرنا چاہئے تھا۔ ان کو روپیہ اور آدمی دہلی سے بھیجے جاتے ہیں، یعنی سارا مقصد دلّی کی آزادی کو مستحکم بنانا تھا مگر اب سید صاحب خلیفہ کہلانے لگے اور ساری دنیا کے ایک بڑے امیر بن گئے۔ یعنی اگر افغان سرداروں کے لیے ان کی اطاعت مذہبی فرض ہے، تو بخارا، ترکی، دوسرے ممالک بھی ان کی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہوسکتے .... امیر شہید کو اس طرح امام مہدی کے درجہ کے قریب لانے کی کوشش کی گئی، اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی۔ ہمارے خیال میں اس تمام تر تغیر میں کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔“ (ص:۹-۱۵۸، حاشیہ)

اس مختصر سی عبارت میں ایسی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا مولانا کے دماغ کے سوا کہیں وجود نہیں۔

(الف) سید صاحب کا مقصد دہلی کی حکومت کو مستحکم بنانا کبھی نہیں رہا۔ سید شہید اور مولانا شہید رحمہ اللہ کے مکاتیب اور بیانات اس باب میں روز روشن کی طرح نمایاں ہیں۔ کہاں دہلی کی حکومت اور کہاں تمام اقطار عالم میں احکام رب العالمین کے اجراء کا عزم بلند ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار | فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

دلّی کی حکومت کا ذکر ابھی اوپر بھی آچکا ہے۔

(ب) سید صاحب یا ان کے ماننے والوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دنیائے اسلام

کے امام مطلق تھے۔ البتہ سرحد کے قیام اور دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں سے حلقۂ نفوذ میں وسعت ضرور ہورہی تھی۔

(ج) ''امام مہدی'' کے قریب لانے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ یہ مولانا کا انتہائی مبالغہ ہے۔

(د)''اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی۔''

گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۲۲ءاور ۱۸۲۶ء کے دوران میں مرکزی حکومت کی کچھ اہمیت باقی رہ گئی تھی؟ اہل علم بتائیں کہ یہ بیان کہاں تک حقیقت سے تعلق رکھتا ہے؟ تاریخ تو ہمیں بتاتی ہے کہ دہلی کی مرکزیت شاہ عالم (۱۱۷۳-۱۲۲۱ھ = ۱۷۵۹-۱۸۰۶ء) ہی کے زمانے میں ختم ہوچکی تھی۔ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶-۱۲۲۱ھ=۱۸۳۷ء-۱۲۵۲ھ) کے دور میں تو دہلی کی حکومت بالکل برائے نام رہ گئی تھی، اور لال قلعہ کی وقعت ایک امیر کی حویلی سے زیادہ نہیں تھی۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ہاشمی جلد سوم ص ۲۸۶-۲۷۱)

(ہ) یہ سب باتیں تو غلط تھیں ہی، لیکن مولانا کا در پردہ یہ فرمانا کہ ''مجاہدین کو کمپنی بہادر نے استعمال کیا'' یا یہ کہ سید صاحب کی امامت اور بیعت میں کمپنی بہادر کو دخل تھا، سراسر بہتان ہے۔ آخر ''اس تمام تر تغیر'' سے مولانا کی مراد ہوکیا سکتی ہے؟ سید صاحب کا دہلی کے مرکز کے تابع نہ ہونا یا ان کا امیر المومنین منتخب ہونا، اس کے علاوہ تو اور کوئی بات اوپر نہیں کہی گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے (اور مولانا اس حقیر سے زیادہ بہتر جانتے ہیں) کہ اس بیعت اور اجتماع کلمہ میں کمپنی بہادر کو ادنیٰ دخل بھی نہیں تھا، سچی بات یہ ہے کہ سید صاحب رحمہ اللہ اوران کے سرفروش مجاہدوں پر اس سے زیادہ اور کوئی ظلم نہیں ہوسکتا۔

''کمپنی بہادر'' کے طرز عمل کی اصل حقیقت

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ مولانا نے آخر ایسی بات کہی کیونکر؟ تو اس کے متعلق بھی

صاف صاف عرض کر دوں۔ بہت سی باتیں ہر موقع پر نہیں کہی جاتیں۔ مگر اب وقت آ گیا ہے تو سن لیجیے۔ کمپنی بہادر کی چال صرف اتنی تھی کہ (۱۲۴۱ھ-۱۸۲۶ء اور ۱۲۴۶ھ-۱۸۳۱ء) تک اور پھر سید صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد بھی الحاق پنجاب (۱۲۶۵ھ- ۱۸۴۹ء) تک اس نے آدمی اور روپیے کی فراہمی میں کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازمین چھٹی لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے۔ [1] مولانا محمد اسحٰق کو ایک مہاجن سے جہادیوں کی امدادی رقم جو اس نے غبن کر لی تھی۔ عدالت سے دلوائی گئی۔ [2] مقصد یہ تھا کہ مجاہدوں اور سکھوں کی معرکہ آرائی میں کچھ سرکار عالی کا فائدہ ہی ہوتا رہے گا۔ [3]

لیکن جونہی پنجاب کا الحاق ہوا۔ (۱۸۴۶ء) کمپنی اور سرکار کی نگاہ میں مجاہدین سے برا کوئی نہیں تھا۔ اور پھر کوئی کسر نہیں تھی، جو انہیں کچلنے کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اور یہی سخت جان لوگ تھے جو ان حالات میں چالیس سال تک حکومت کا مقابلہ کرتے رہے۔ [4]

یہ ہے مولانا کے الزام کی حقیقت جو صاف صاف بیان کر دی گئی، لیکن مولانا اسی الزام کو دوسری جگہ اس طرح دہراتے ہیں کہ اس کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، وہ سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کے جاں نثاروں کو کمپنی بہادر کا آلۂ کار بتاتے ہیں، مگر کوئی دوسرا

---

(۱) OUR INDIAN MUSALMANS

(۲) SIR SYED AHMAD ON DR. HUNTERS, OUR INDIAN MUSALMANS. (۲۱-۲۲ص، ۱۸۷۲ء مطبوعہ لندن)

(۳) اب اگر سکھوں اور مجاہدین ہند کی باہمی معرکہ آرائی سے واقعی کمپنی بہادر کو کچھ فائدہ پہنچا تو اس کا الزام سکھوں اور ان کی ظالمانہ روش پر عائد ہوتا ہے۔

(۴) ملاحظہ ہو: (۱) سیرت سید احمد شہید باب چہارم۔ (۲) تواریخ عجیب (مولوی محمد جعفر تھانیسری) (۳) تذکرہ صادقہ (مولانا عبدالرحیم صادق پوری) (۴) ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSALMANS (۵) ٹیلر (TAYLOR) کی THIRTY EIGHT YEARS IN INDIA وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی بے بنیاد بات کہتا تو اس کو ناواقفیت اور تعصب پر محمول کر کے صبر کر لیتے لیکن اگر سید شہید رحمہ اللہ کے اصحاب خاص پر مولانا سندھی کمپنی سے ساز باز کا الزام لگائیں تو بتائیے کہ صبر کے لیے پتھر کا کلیجہ کہاں سے لایا جائے۔ فإلى الله المشتکی۔

"...فكان (كانت) الحرب بينهم وبين المتغلبين على مسلمى الفنجاب (فنجاب) سجال (؟ سجالا) حتى اندهش منهم اداء الجمعية النجاديه الا نكليزيه فاستعانوا بالمسلمين الخالفين للولى اللّٰهيين و أمدّوهم بالاموال فوصلوا إلى بلادالافاغنة فأوقعوا الشقاق بين الهنديين المهاجرين وبين الافاغنة الوطنيين. (ص ۱۴۸ بحوالہ کتاب التمہید)

"تو مجاہدین اور مسلمان پنجاب کے (خودساختہ) ظالم حاکموں کے درمیان لڑائی برابر کی رہا کی، تا آنکہ کمپنی بہادر کے اہلکاروں کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی، اس لیے انہوں نے ان مسلمانوں سے کام لیا، جو ولی اللّٰہیوں کے مخالف تھے، اور ان کی روپیوں سے امداد کی تو یہ لوگ افغانوں کے ملک میں آئے، اور انہوں نے ہندی مہاجنوں اور ملکی افغانوں کے درمیان فتنہ وفساد کی آگ بھڑکا دی۔"

علمائے صاق پور کا اصل "گناہ" عمل بالحدیث

آپ سمجھے یہ سرکار کمپنی کے آلۂ کارکون تھے، بڑے بڑے عالم متبع سنت، جہاد کے شیدائی شوکانی اور مولانا شہید کے شاگرد اور پھر ان پر یہ الزام کیوں تراشا گیا۔ اس لیے کہ وہ حنفی نہیں تھے، ائمہ حدیث کے مسلک کے مطابق رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے، اور مولانا کے خیال میں ولی اللّٰہیوں کے مخالف بھی تھے۔ ہمارے وہم میں بھی یہ بات نہیں

آئی تھی کہ حنفیت کی عصبیت ایک وسیع النظر عالم کوایسی غلط بیانیوں پر آمادہ کرسکتی ہے۔ہم یہ نہیں کہتے کہ سید صاحب معصوم تھے یا ان کے سرفروش اہل حدیث جانثاروں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ان میں سے گرم لوگوں نے افغانی علاقے میں عمل بالحدیث پراصرار کر کے اگر یہ واقعہ ہے، مصلحت شناسی کا ثبوت دیا،لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ سید صاحب اوران کی جماعت کے مخصوص اور با اثر اصحاب کا دامن کسی اجنبی حکومت کے ساتھ سازباز سے یکسر پاک رہا ہے۔

ہندوستان کے عاملین بالحدیث سے مولانا بہت رنجیدہ ہیں۔ اس پر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ابھی تو سید صاحب رحمہ اللہ ہی پراعتراضات کا سلسلہ جاری ہے۔

سید صاحب ''ڈکٹیٹر'' تھے؟

ہندوستانی انقلاب کی جوخصوصیت اس تحریک کے ذاتیات میں داخل تھی وہ تقییداً کمزور ہوتی گئی۔یعنی ماورائے سندھ کا مرکز مستقل بن کر دہلی سے سرکشی اور بغاوت کر رہا ہے،جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب ولی اللہ کی حکومت کا طریقہ بورڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹرشپ) میں تبدیل ہو گیا۔اس طرح امیر شہید امیر المؤمنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے گئے۔(ص ۹-۱۵۸)

ان طنزیات کا نمونہ اوپر گذر چکا ہے، البتہ سرکشی اور بغاوت کے میٹھے بول قابل توجہ ہیں۔رہی ڈکٹیٹرشپ اور شخصی امارت تو یہ سید صاحب اوران کے وزیر شہید کی اپنی ایجاد نہیں اگر یہ ایسی ہی نا قابل قبول اور گردن زدنی چیز ہے تو پھر سید صاحب نے کون سا قصور کیا ہے؟ خلافت راشدہ اور شیخین رضی اللہ عنہما ہی کو ہدف ملامت بنانا چاہیے۔ باقی ''امیر المومنین'' اور ''مصلح خلیفہ'' کے طعنے تو افسوس کہ یہ شیخ الہند کے شاگرد اور حکمت ''ولی اللّٰہی''

کے شارح ومفسر کی زبان سے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ہم نیازمندوں کی کیا مجال کہ جواب میں کچھ عرض کرسکیں:

قومی هُمُ قتلوا اُمیم أخی فاذا رمیتُ یُصیبنی سَھْمی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ڈکٹیٹر شپ (امامت) کی مولانا نے ایک اور توجیہ پیش کی ہے:

''اس کے بعد (ہنڈ کی بیعت کے بعد) ایک سال تک مولانا عبدالحی (ف ۱۲۴۳ھ) زندہ رہے۔ان کی موجودگی میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا۔سید احمد شہید ان کے سامنے اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کررہا تھا۔''(ص ۷۔۱۵۶)

اگر سید صاحب رحمہ اللہ کسی مسئلے میں بھی اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کرسکتے تھے تو ان کی بیعت پر اجماع ایک لغو فعل تھا اور مولانا عبدالحی نے بیعت کرنے میں سخت غلطی کی تھی۔ اسلام میں شوریٰ کی تاکید ضرور ہے لیکن 'امام' ہرحال میں مجلس شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں، کیا مولانا عبدالحی بڈھانوی سا عالم[1] متبحر اتنی سادہ حقیقت بھی نہیں جانتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی کی اس قسم کی توجیہوں کی زد صرف سید صاحب ہی پر نہیں، بلکہ ان کے حزب ولی اللّٰہی کے خاص ارکان پر بھی پڑتی ہے۔

اور مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کے اس اثر ونفوذ کی تائید میں حسب ذیل قصہ دہرایا گیا ہے:

''سید احمد شہید رحمہ اللہ ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے نماز سے فارغ ہوکر مولانا عبدالحی نے ''مابال اقوام'' کے طور پر فرمایا کہ ایسے لوگ جو سنت کے احیاء کے مدعی ہیں وہ جماعت میں بھی صحیح

---

(۱) خود شاہ عبدالعزیز انہیں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے تھے۔(سیرت سید احمد شہید،ص:۳۱۵)

طور پر حاضر نہیں ہو سکتے۔ سید صاحب نے فرمایا، مولانا آپ کا یہ ارشاد حق ہے اور ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہوگی، اور یہ آپ کا فرض ہے، کہ آپ اس طرح ٹوکیں، مولانا عبدالحی نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے، آپ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہیے، ہر روز کون ٹوک سکتا ہے؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو۔ (۱)

پہلے اس قصے کے آخری فقروں کا تیور ملاحظہ ہو، اس کے بعد مصنف سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کا یہ بیان جو اپنی جگہ پر کافی وشافی ہے۔

''سید صاحب کی جماعت میں آپ کی وہ حیثیت تھی جو بلا تشبیہ صحابۂ کرام میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کی آپ پر شان صدیقیت اور شاہ صاحب رحمہ اللہ پر شان فاروقی غالب تھی،...امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نہایت چست ومستعد رہتے، اور اس میں اپنے شیخ کا بھی جس سے زیادہ محترم ہستی، آپ کی نظر میں کوئی نہ تھی لحاظ نہ کرتے۔ ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحب رحمہ اللہ کو خلاف معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہوگئی، دوسرے دن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت، سید صاحب خاموش ہو گئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں سید صاحب رحمہ اللہ کی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی، اس دن مولانا عبدالحی نے اسی کا وعظ فرمایا، ایک مرتبہ سید صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر مجھ سے کوئی بات خلاف سنت دیکھیے، متنبہ کر دیجئے گا۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت! جب کوئی مخالف سنت فعل آپ سے عبدالحی دیکھے گا تو وہ آپ کے ساتھ ہوگا ہی کہاں...''

(ص ۷-۳۱۶ / طبع دوم)

اوپر مولانا ابوالحسن علی حسنی نے بھی مولانا عبدالحی کے احتساب کے تین واقعے بیان

---

(۱) اصل میں فقرے خط کشیدہ نہیں۔

کیے لیکن کہیں وہ تلخی نہیں، جو مولانا سندھی کی روایت میں ملتی ہے اور پھر لہجے کی تلخی، مندرجہ ذیل واقعہ پڑھ کر اور بھی بعید معلوم ہوتی ہے۔ مولانا سندھی کی روایت ہے[1]:

''جب مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کا آخری وقت تھا، تو سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ مولانا آپ کی اگر کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کردوں۔ آپ نے کہا کہ آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں، یہی ایک خواہش باقی ہے، سید صاحب نے اس کی تعمیل کردی۔ الغرض ادب بھی انتہا درجہ کا ملحوظ ہے۔ اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی قوت بھی ہے۔'' (حاشیہ ص: ۱۵۸)

اب یہی واقعہ سید صاحب رحمہ اللہ کے مستند سیرت نگار کی زبانی ملاحظہ ہو:

''انتقال کے وقت سید صاحب رحمہ اللہ سے فرمایا کہ حضرت شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی۔ اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدم مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجیے کہ اسی حالت میں میری جان نکل جائے، سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ اس سینہ پر رکھوں جو قرآن وحدیث کے علم کا خزینہ ہے۔ آپ نے تسلی کے لیے اپنا ہاتھ آپ کے سینہ پر رکھ دیا۔ اور اسی حالت میں آپ کا انتقال ہوگیا۔'' (سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۲)

دیکھیے دونوں روایتوں کی زبان میں کتنا فرق ہے۔ بہر حال ہمیں ان روایتوں کی صحت سے انکار نہیں۔ (البتہ مولانا سندھی کی روایت میں بعض فقرے بعید معلوم ہوتے ہیں) لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد سید صاحب بے قابو ہوگئے، بالکل غلط ہے۔ آخر مولانا شہید رحمہ اللہ تو آخری لمحہ حیات تک ساتھ ہی رہے (جن پر بقول ابوالحسن علی شان فاروقیت غالب تھی)۔

---

(۱) یہ ہر دو واقعے ہمیں مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ نے سنائے۔ غالباً انہوں نے مولانا محمد قاسم یا مولانا رشید احمد رحمہ اللہ سے سنے ہوں گے۔ (ص ۱۵۸/حاشیہ)

”شمسی قومی نوروز“ منانے کی تلقین

مولانا ایک طرف تو سید صاحب رحمہ اللہ کی امارت و امامت سے برہم ہیں (جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا) دوسری طرف انعقاد بیعت کی تاریخ کو ”وہ شمسی قومی نوروز“ بھی منانا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:

”۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی، اور ۱۲ جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی قبائل نے بھی ہنڈ میں سید احمد کو اپنا امیر مان لیا۔“ (ص ۱۵۶)

ہنڈ پر حاشیے میں لکھتے ہیں:

”ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے۔ یہ ہنڈ وہی مقام ہے جہاں ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ کو ”فرقہ ولی اللہیۃ“ کے مقدمۃ الجیوش نے جسے امام عبد العزیز دہلوی نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی۔ اس کے رئیس امیر شہید دہلوی (؟ بریلوی) تھے، جمہور مسلمین نے بیعت کی اور انہیں امیر مان لیا گیا۔

اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰/ جنوری[1] ۱۸۲۷ء کے موافق تھی، اس لیے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ۱۰/ جنوری کو منایا جائے گا۔ جس قدر ہندوستانی مسلمانوں میں قومی روح پیدا ہوگی، اسی انداز سے وہ

(۱) ہم ابھی اوپر لکھ آئے ہیں کہ ۱۲/ جمادی الآخرۃ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے (تقویم ہجری و عیسوی) سیرت نگاروں نے دن کی تعیین نہیں کی اس لیے یقین کے ساتھ ان دونوں تاریخوں میں کسی ایک کو ترجیح نہیں دی جاسکتی قمری مہینوں کی مطابقت میں یہ فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

ہماری تجویز کی تائید کریں گے۔"(ص:۱)

اس ارشاد گرامی کا خلاصہ ان دفعات میں کیا جا سکتا ہے:

(۱) سید صاحب رحمہ اللہ کی امارت مان لی گئی۔

(۲) انعقاد بیعت کی تاریخ نہایت مہتم بالشان اور وہ دن ایک تاریخی دن ہے۔

(۳) شمسی قومی نوروز منایا جائے۔

(۴) ہندوستانی مسلمان میں قومی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

کاش! مولانا ہمیں بتاتے کہ امام ولی اللہ رحمہ اللہ نے کس کتاب میں شمسی قومی نوروز منانے کی تلقین کی ہے۔ یا اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے؟ دوسری بات یہ عرض کرنا تھی کہ سید صاحب کی امارت مطلقہ "یعنی اندرون ہند کی نگرانی سے آزاد" تو غلط تھی، پھر ان کے انعقاد بیعت کا دن اتنا اہم کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟

باقی "نیشنلزم" کے متعلق تو مولانا کا خیال واضح ہو چکا ہے اس لیے کچھ مزید عرض کرنا بے سود ہے۔

رہا ایک مسلمان کا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیے؟ تو اسے عارف رحمۃ اللہ علیہ سیالکوٹی کی زبان سے یوں ادا کر سکتے ہیں: ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

(اقبال)

اس سلسلے کی ایک اور بات رہ گئی۔ امام عبد العزیز (ف ۱۲۳۹ھ) کے بعد مسند درس کی جانشینی مولانا محمد اسحق رحمہ اللہ کو تفویض ہوئی، اس سے مولانا نے شاہ محمد اسحق صاحب کی

امارت مطلقہ پر استدلال کیا ہے۔[۱] حالانکہ اس سے مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ جب سید صاحب کی امامت پر ہندوستان اور ماوراءسرحد کے تمام مجاہدوں اور ولی اللّٰہیوں نے بیعت کرلی اورشاہ اسحاق صاحب نے اس پراعتراض نہیں کیا۔ بلکہ برابر آدمی اورروپے سے مدد کرتے رہے،تو ان کی حیثیت اندرونی ناظم اور وکیل سے زیادہ نہیں رہ جاتی ، جیسا کہ خود مولانا کتاب ''التمہید'' میں اعتراف کر چکے ہیں، رہا مدرسہ کا سپرد کیا جانا،تو اس کی حیثیت ایک مقامی ضرورت کی انجام دہی سے زیادہ نہیں ہے (اور بقول حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدرسوں اور حجروں کا کام تو ہر کوئی کر لیتا ہے لیکن میدان والا کام کم لوگوں سے بن آتا ہے۔او کما قال فی کتابہ ''تذکرہ'') اس سے شاہ محمد اسحاق صاحب کا علمی مرتبہ ضرور معلوم ہوتا ہے جس میں کسی چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ اور اگر صرف مسند درس کی جانشینی امارت وامامت پر دلالت کرتی ہے،تو مولانا کیا فرمائیں گے۔؟

سید نذیر حسین رحمہ اللہ کی جانشینی

میاں صاحب مولانا سید نذیر حسین محدث (سورج گڑھی مونگیری) دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ-۱۹۰۲ء) کی امامت کے بارے میں؟ شاہ محمد اسحق صاحب کی ہجرت (شوال ۱۲۵۸ھ) کے بعد میاں صاحب ہی جانشین ہوئے۔اورانہوں نے مسلسل ایک عرصۂ دراز

---

(۱) مولانا فرماتے ہیں''امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعت طریقت لینے کے لیے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ میں بیعت جہاد لینے کے لیے دورے پر بھیجا۔اسی کے بعد سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا۔تا کہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے۔ جب قافلہ حج سے ۱۲۳۹ھ میں واپس آیا تو امام عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے۔انہوں نے آخری وقت میں مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کر کے اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔''(ص ۱۵۳)

تک مسند ولی اللہی (۱) پر درس دینے کی عزت حاصل کی، پھر آپ شاہ اسحٰق صاحب کے بعد امارت اور اپنے حزب ولی اللہی قیادت حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) کو کیوں

---

(۱) مولانا شاہ صاحب کے مدرسہ کو ولی اللہ کالج کہنا پسند کرتے ہیں۔(حاشیہ ص: ۴۳،ص: ۴۷) پتہ نہیں کالج کے لفظ میں کیا جادو ہے؟ کہ ہمارے اکابر بھی اس سے مسحور ہیں۔آگے بڑھ کر،ص ۴۴ حاشیہ شاہ محمد اسحاق صاحب (ف: ۱۲۶۲ھ) کی ہجرت (۱۲۵۸ھ حیات بعد المات ص: ۵۳) کے بعد میاں صاحب کی جانشینی کا تذکرہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، جانے کیوں مولانا اہل حدیثوں سے اتنے بیزار ہیں؟

ص.ی. حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی جانشینی کو مولانا سندھی کے علاوہ دیگر علمائے احناف نے بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔حالانکہ تاریخی طور پر یہ ایک مسلمہ بات ہے۔چنانچہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مدرسے کے دوسرے معلم مولوی عبدالخالق کے داماد، شمس العلماء علامہ سید نذیر حسین تھے جن کے علم و فضل کا یہ مرتبہ تھا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب مہاجر مکی نے ہجرت کے وقت افادہ وافتاء اور تدریس کی خدمت ان کے سپرد کر کے خلیفہ وجانشین مقرر فرمایا تھا۔'' (مولوی نذیر احمد دہلوی۔احوال وآثار،صفحہ ۴۶ مجلس ترقی ادب لاہور،نومبر ۱۹۷۱ء)

اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث واحناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے۔احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا۔اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں۔مجھے نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بہ تصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے۔عبارت یہ ہے:

''ودرہمیں سال (سنة الف و مأیتن و تسع و اربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ شروع فرمودند وصحیح بخاری وصحیح مسلم بہ شراکت مولوی محمد گل کابلی ومولوی عبداللہ سندھی ومولوی نوراللہ سروانی وحافظ محمد فاضل سورتی وغیرھم حرفاً حرفاً خواندند وہدایہ وجامع صغیر بہ معیت مولوی بہاؤالدین دکنی وجد امجد قاضی محفوظ اللہ پانی پتی نواب قطب الدین خاں دہلوی وقاری اکرام اللہ وغیرھم وکنزالعمال ملّاعلی متقی علیحدہ شروع فرمودند ودوسہ جزء خواندند وسنن ابی داؤد وجامع ترمذی ونسائی وابن ماجہ وموطا امام مالک بتمامہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند واجازت از شیخ الآفاق حاصل نمودہ۔''

البتہ شاہ صاحب سے سند واجازت تحریری انہوں نے دوشوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی ہے جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے جارہے تھے۔(حیات شبلی''،ص:۴۵-۴۶ (حاشیہ) دارالمصنفین اعظم گڑھ)

سونپتے ہیں؟ گویا آپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مسند درس کی جانشینی حزب کی امامت و امارت کے لیے کافی نہیں۔

تذکرہ نگاروں پر برہمی

سید شہید رحمہ اللہ کے ساتھ مولانا ان کے تذکرہ نگاروں اور ثنا خوانوں سے بھی برہم ہیں، جس کا کوئی شکوہ نہیں، البتہ رنج اس بات کا ہے کہ کہیں کہیں ان مخلصوں پر بے جا حملے کیے گئے ہیں، ص ۷۷ میں مولانا نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور خواب کا ذکر کیا ہے اور شارح نے کتاب التمہید کی عبارت کے ساتھ سیرت سید احمد شہید (ص ۶۴، طبع دوم) سے بھی مندرجہ ذیل سطریں نقل کی ہیں۔

> ''صبح اٹھ کر شاہ صاحب'' سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور خواب کی تعبیر چاہی، شاہ غلام علی نے فرمایا... کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے (یا آپ کے کسی مرید[1] رشید) کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری ہوگا۔'' (ص:۷۸)

اس کے بعد شارح مولوی نور الحق صاحب علوی فرماتے ہیں:

> ''مولانا الشیخ عم فیضہم نے مجھ سے ۲۶؍جون ۱۹۴۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے کہ اُن کے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی۔ رہا فقرہ محصورہ بین الخطین، ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علی رحمہ اللہ کے ذمہ لگا کر محض اس لیے بڑھایا گیا کہ سید امیر شہید کی فضیلت ثابت کی جاسکے۔ ورنہ اصل خواب سے اس کو کوئی

---

(۱) سیرت سید احمد شہید میں یہ فقرہ بین الخطین نہیں ہے۔ (طبع دوم ص ۶۴، طبع اول ص ۷۸)

تعلق نہیں ہے۔''

آپ نے دیکھا پہلے ''یا آپ کے کسی مرید رشید'' والے فقرے کو بین الخطین کیا گیا، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ فقرہ محصورہ بین الخطین بعد کا اضافہ ہے۔ سبحان اللہ!! اعتراض کی کیا دلچسپ صورت نکالی گئی ہے۔

''خود کوزہ گر دخود گل کوزہ'' شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ فقرہ مذکورہ بعد کا اضافہ نہیں ہے۔ سیرت سید احمد شہید کے مصنف نے یہ واقعہ غالباً مخزن احمدی سے لیا ہے۔ جو سید صاحب رحمہ اللہ کے بڑے بھانجے (اوران سے عمر میں بڑے) ان کے خلیفہ اور رفیق سفر مولوی سید محمد علی صاحب (ف:۱۲۶۶ھ) کی تصنیف ہے سال تصنیف (۱۲۶۱ھ-۱۸۴۵ء) بہرحال انہوں نے جہاں سے بھی لیا ہو یہ واقعہ مخزن احمدی میں بعینہ مذکور ہے، جو سید صاحب کی ابتدائی حالات میں سب سے بڑا ماخذ ہے۔ ملاحظہ ہو:

''...صبح گاہان امام المحدثین بملاقات حضرت سید غلام علی صاحب کی از خلفائے حضرت شمس الدین شہید کہ مشہور بہ مرزا مظہر رحمہ اللہ اندر فتہ ایں رویا بیان نمود وتعبیرش خواستند... سید علیہ الرحمۃ نمے سر بگریباں آوردہ فرحاں و خنداں فرمودند کہ صاحب در ذہن ناقص چناں معلوم می شود کہ حضرت سید المرسلین علیہ الصلوۃ والتسلیم بخلائق از وفات حضرت سید حسن رسول نما کہ مدت یک صد و پنجاہ سال گزشتہ موقوف و مسدود است اینک ایں حالت غریبہ از دست شما یا یکے از مریدان شما ظاہر و منتشر خواہد شد...''

(مخزن احمدی (قلمی) ورق ۲۸، الف وب مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ نمبر ۱۳۸۵)

ہم نہیں سمجھتے کہ مولوی سید محمد علی صاحب نے یہ فقرہ (یا یکے از مریدان شما) اپنی طرف سے تصنیف کیا ہوگا، کم سے کم سید صاحب کے خلفاء اور رفیقوں کے بارے میں ہم ایسی بدگمانی نہیں کرتے۔

تذکرہ نگاروں کا ذکر خیر ایک دوسرے موقع پر اس طرح کیا گیا ہے۔

''ہمارے زمانے کے مورخین نے اس تحریک کے بیان میں بہت غلطیاں کی ہیں۔ وہ سید صاحب کا تعلق امام عبدالعزیز سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ اور امیر شہید کو ایک مہدی منتظر کے درجے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔'' (ص:۱۱۵)

ہمارے زمانہ کے سیرت نگار مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مقبول کتاب ''سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ'' پڑھ کر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ انہوں نے امام عبدالعزیز سے سید صاحب کے تعلق کو کاٹنے کی کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہے؟ (ملاحظہ ہو، سیرت سید احمد شہید ص:۵۳۔۵۸) اور ہمارے زمانے سے پہلے کے تذکرہ نگار مولوی سید محمد علی صاحب اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (اسیر پورٹ بلیر و متہم مقدمۂ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) کی کتابیں موجود ہیں۔ ہر منصف مزاج پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ مولانا کا یہ الزام کہاں تک صحیح ہے؟ ''مہدیٔ منتظر'' کا افسانہ سراسر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ سید صاحب رحمہ اللہ کے متعلق یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی، انہیں دینی علوم سے ضروری واقفیت تھی، اس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ (سیرت سید احمد شہید ص:۵۸) لیکن بدگمانی کا برا ہو، مولانا اس سے بھی غلط نتیجہ نکالتے ہیں۔

''...اس طرح پر ہم سید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں۔ ان کے مناقب لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے، بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں۔ ان کی خواہش دراصل یہ ہے کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے وہ کاٹ دیا جائے، اور وہ ایک امام مہدی کے طور پر مانے جائیں، ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا۔'' (ص:۱۴۴)

مولانا فرماتے ہیں کہ ''ان کے مناقب لکھنے والے دھوکا دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے

نہ تھے'' اچھا تو سنئے سید شہید کے وزیر ومشیر اور تتمۂ دود مان ولی اللہی، حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ (نضّر اللہ وجهه یوم القیامة) فرماتے ہیں:

''اگر چہ احسن و اولیٰ در تالیف ایں کتاب چناں می نمود کہ بطور یکہ در تحریر اکثر مضامین ایں کتاب محض بر ترجمہ آنچہ از زبان ہدایت نشان حضرت ایشاں صدور یافتہ بود اکتفا کردہ شد در تمامی مضامین ہماں راہ پیمودہ می شد، لیکن از بسکہ نفس عالی حضرت ایشاں بر کمال مشابہت جناب رسالت مآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدو فطرت مخلوق شدہ بناءً علیہ لوح فطرت ایشاں از نفوس علوم رسمیہ و راہ دانشمندان کلام و تقریر و تحریر مصفی ماندہ بود... الخ۔'' (دیباچہ صراط مستقیم: ص ۴)

بتائیے، کیا مولانا شہید بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔؟

اب ایک آخری جملہ ملاحظہ ہو، حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

''یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعۂ بالاکوٹ پر امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دینا چاہتا ہے، وہ پہلے امیر شہید کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا اور نہ امام ولی اللہ کا اور نہ پشاور کی حکومت موقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاق کی امامت یا صدارت سے (جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی) کوئی تعلق تھا، اس کے بعد وہ آسانی سے امیر کی شہادت سے تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔'' (ص: ۱۷۵)

(الف) ''چالاک تاریخ نویس'' مشہد بالاکوٹ کو تحریک کا خاتمہ اس معنی میں قرار دیتا ہے کہ احیائے نظام خلافت راشدہ (حکومت دہلی کی تجدید نہیں) کی ایک منظم اور ہمہ

گیر کوشش جوحضرت سید شہید رحمہ اللہ کی قیادت میں ہورہی تھی، ظاہراً ناکام رہی اور فوری طور پر اس نہج پر دوسری ہمہ گیر تحریک اٹھانے کی توقع بھی جاتی رہی۔ ورنہ سید شہید کے ماننے والے اس المناک واقعہ کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اسی مقصد عظیم کے لیے جان اور سرکی بازی لگاتے رہے اور آج بھی ایک جماعت آیت ربانی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيْلاً. (الاحزاب:۲۳)

''ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں اور اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انہوں نے ذرا تغیر تبدل نہیں کیا۔''

کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

کارتجدید کا سہرا کس کے سر ہے؟

(ب) امام ولی اللہ رحمہ اللہ اور امام عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تجدیدی کوششوں کا کس نے انکار کیا؟ البتہ محققین امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں اسلامی تجدید کا سہرا مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (ف: ۱۰۳۴ھ) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (ف: ۱۱۷۶ھ) اور مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ (ف ۱۲۴۶ھ) کے سر باندھتے ہیں، مولانا آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا شہید رحمہ اللہ ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔[1] استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ[2] (حضرت مجدد

---

(۱) راقم نے ایک مرتبہ (۳۵ھ) میں مولانا آزاد سے عرض کیا کہ یہ مقامِ تجدید تو حضرت سید صاحب کا منصب ہے، مولانا شہید رحمہ اللہ بہر حال ان کے مرید تھے، مولانا نے فرمایا کہ ''میرا تاثر وہی ہے۔''

(۲) طبع اول کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ زندہ تھے۔ (ص.ی.)

سرہندی اور امام ولی اللہ رحمہ اللہ کے بعد) حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل شہید دونوں بزرگوں کو ''تجدید دین کی نئی تحریک'' کا امام سمجھتے ہیں:

''تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا۔ مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد رحمہ اللہ بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔۔۔۔'' (مقدمہ سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ)

ہندوستان میں اسلامی تجدید پر یہ مقدمہ بے مثال چیز ہے۔ لیکن اس میں کہیں شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام مجدد یا مفکر کی حیثیت سے نہیں آیا۔ مولانا ابوالکلام اور کھل کر اپنے مخصوص انداز بیان میں رقم طراز ہیں:

''...پھر کیا اس وقت ہندوستان علم و عمل سے خالی ہو گیا تھا؟... خود اس خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم و عمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے،... بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن آیا؟...'' (ملاحظہ ہو تذکرہ، ص ۲۴۴۔۲۴۶)

اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی اپنے مقالہ تجدید و احیائے دین (الفرقان ولی

اللہ نمبر ص: ۸۔۹۱) میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی امامت کا بالکل ذکر نہیں کرتے (البتہ ان کے حلقہ تدریس کی عظمت کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں) اور ان دونوں شہیدوں کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتے ہیں۔

''یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا۔ جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کے منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھئے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئے گی... سید صاحب رحمہ اللہ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ (مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ) دونوں روحاً و معناً ایک وجود رکھتے ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں...۔'' (ص: ۹۱-۹۲)

اب آپ بتائیں کہ وہ کون ''چالاک تاریخ نویس'' ہے جو اس سے زیادہ کچھ کہتا ہے؟ سید صاحب رحمہ اللہ کے تذکرہ نگار تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو ان کا پیر اور استاد تسلیم کرتے آئے ہیں۔

(ج) مولانا محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کی ''امامت اور امارت مطلقہ'' البتہ ہمیں تسلیم نہیں۔ ہم انہیں درس گاہ ولی اللہی کا جانشین اور سید صاحب رحمہ اللہ کی جہادی سرگرمیوں میں معاون و مددگار مانتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہیے تو ہم آپ ہی کی اصطلاح اور زبان میں حکومت موقتہ کا ''وکیل'' مان لیں۔ روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان کے لیے ''وکیل حکومت'' ہی کا منصب تجویز کرتی ہے۔

(د) رہی ''امیر شہید'' کی عظمت اور اس پر زور دینے کا سوال، تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ اور

اگر آپ کے خیال میں یہ گناہ ہے تو ''صدر شہید'' اس راہ کے پہلے خطاوار ہیں۔صراط مستقیم کے دیباچے میں مولانا شہید رحمہ اللہ نے سید صاحب رحمہ اللہ کے نام نامی کے ساتھ تکریم و توصیف کے جو القاب استعمال کیے ہیں، ان سے زیادہ آج تک کسی عقیدت مند نے نہیں لکھا ہوگا۔

''امابعد میگوید... بندۂ ضعیف محمد اسماعیل کہ نعم الٰہی در بارہ ایں ضعیف نامتناہی است و ازا عاظم آں حضور محفل ہدایت منزل ملازمان فخر خاندان سیادت مرجع ارباب ہدایت مرکز دائرہ ولایت دلیل سبیل فلاح و رشاد رہنمائے طریق استقامت وسداد، مظہر انوار نبوی منبع آثار مصطفوی، سلالۂ خاندان صلب طاہر سید الاولیا اعنی علی مرتضیٰ۔ نقادۂ دودمان سبط اکبر سند الاصفیاء اعنی حسن مجتبیٰ۔مقتدائے اصحاب شریعت، پیشوائے ارباب طریقت، ہادی زمانہ مرشد یگانہ سراج المحبین، تاج المحبو بین الامام الاوحد السید احمد متع المسلمین بطول بقائہ ونفعنا وسائر الطالبین باقوالہ واحوالہ وایں ضعیف دراوان حضور آں مجلس ملائک انس باستماع کلمات ہدایات آیات'' الخ الخ۔(صراط مستقیم ص:۸)

ابوالحسن علی ندوی ''صاحب سیرت سید احمد شہید'' تو بہر حال محتاط ہیں، مولوی جعفر تھانیسری جیسے عاشق صادق نے بھی تکریم وتوصیف کے اتنے القاب نہیں استعمال کیے، ہمیں بتایا جائے کہ وہ کون ''چالاک تاریخ نویس'' ہے، جس نے مولانا شہید سے زیادہ سید صاحب کی عظمت پر زور دیا ہے؟

ایک ضروری وضاحت

راقم اوپر لکھ آیا ہے کہ سید صاحب رحمہ اللہ کی بیعت کے موقع پر شیخین (مولانا عبدالحی

رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ) موجود تھے۔ اب مزید چھان بین کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مولانا عبدالحی رحمہ اللہ ہجرت و جہاد میں سید صاحب رحمہ اللہ کے ہمراہ نہیں جا سکے تھے۔ کسی خدمت کے سرانجام دینے کے لیے وہ ہندوستان ٹھہر گئے تھے۔ (سیرت سید احمد شہید ص ۱/ ۳۲۰) مولانا عبدالحی رحمہ اللہ جنگ سیدو کے بعد سوات بیز کے علاقہ میں سید صاحب سے ملے (قبیل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ) ہجرت ۱۲۴۱ھ کے آغاز میں شروع ہوئی۔ اور بیعت شبخون حضرو کے بعد لی گئی (۱۲/ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ، سوانح احمدی ص ۱۰۵، وص ۱۰۱) مولانا عبدالحی رحمہ اللہ کی وفات شعبان ۱۲۴۳ھ میں ہوئی۔

گویا مولانا عبدالحی رحمہ اللہ میدان جہاد میں سید صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ آٹھ نو مہینے سے زیادہ نہیں رہے۔ اب اس قلیل عرصہ میں سید صاحب رحمہ اللہ پر کس قدر حاوی رہے ہوں گے؟ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ مولانا عبدالحی رحمہ اللہ گو بیعت میں شریک نہیں تھے لیکن سید صاحب رحمہ اللہ کی امارت میں اور ان کے جھنڈے کے نیچے برابر جہاد میں مصروف رہے، اور یہ وابستگی آخر دم تک قائم رہی، جیسا کہ سیرت سید احمد شہید سے معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۲۲۔ ۳۱۵)

ناکامی کے اسباب؟

(ii) مولانا سندھی رحمہ اللہ نے سید صاحب پر استبداد بالرائے، ڈکٹیٹریت اور اس قسم کے دوسرے الزام لگائے ہیں، اور سید صاحب کی ''انہی غلطیوں'' کو ناکامی کا سبب قرار دیا ہے، ہم نے طوالت کے خوف سے ناکامی کے اسباب پر گفتگو نہیں کی۔ حاشیہ میں اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ اتنا لکھ دیا ہے کہ ہم سید صاحب رحمہ اللہ کو معصوم نہیں کہتے۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ یہ صرف راقم کا خیال ہے ان کے ''منقبت نگار'' تو انہیں معصوم ہی کہتے آئے ہیں۔ اس شبہ کے دفعہ کے لیے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کا یہ بیان

کافی ہوگا۔

''بوجہ اپنی پاک باطنی اور صفائی قلب اور توکل زہد اور اولوالعزمی کے اس بے نظیر بزرگ کو پولٹیکل پیچیدگیوں اور علم فن جنگ کی طرف بالکل توجہ نہ تھی۔ انہی دو نقصوں نے اس کام کو بگاڑ کر آخر اس کو بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا کہ جس کی یاد سے آج تک ہزاروں خلقت کے دل دکھتے ہیں...'' (سوانح احمدی ص ۱۳۹)

یہ دو نقص بھی ناکامی کے اسباب میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ناکامی کے وجوہ اس سے زیادہ گہرے ہیں، جن سے سید صاحب کے تذکرہ نگاروں نے (بہ شمول مولوی محمد جعفر تھانیسری، مولانا ابوالحسن علی ندوی) سیر حاصل ''بحث'' نہیں کی۔

سید صاحب کے بارے میں مولانا گنگوہی کے تاثرات

ابھی ابھی مولانا سندھی کی اس شکایت کا ذکر آیا ہے کہ سید صاحب کے تذکرہ نگاران کے کمالات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ حضرت شاہ عبد العزیز سے ان کا سلسلہ منقطع ہو جائے، اور وہ تحریک کے ''ماں باپ'' ثابت ہوں۔ (ص ۱۷۵، ۱۴۴) ہم نے جواب میں عرض کیا کہ شکایت بے جا اور خلاف واقعہ ہے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب سے سید صاحب رحمہ اللہ کے تلمذ اور ارادت کا انکار کسی نے نہیں کیا، بلکہ اسے سب فخریہ بیان کرتے آئے ہیں۔ پچھلے دنوں حسن اتفاق سے مولانا سندھی کے استاذ الاستاذ (اور استاذ بھی) مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (ف ۱۳۲۳ھ) کے بعض تاثرات نظر سے گذرے جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سید صاحب رحمہ اللہ کی محبت وعقیدت میں انہیں حد درجہ غلو تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ حضرت سید شہید کے متعلق مولانا سندھی کے استاذ (اور ان کے حزب دہلوی کے امام) کے خیالات بھی ناظرین کے سامنے آجائیں۔ ملاحظہ ہو

مولانا حکیم سید عبدالحی (ف ۱۳۴۱ھ) مولانا رشید احمد صاحب کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"...فرمایا کہ سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے اعتبار سے طرق انہوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے،... بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کر دی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب رحمہ اللہ ہوئے... پھر فرمایا کہ مجھ کو حضرت سید صاحب کے ساتھ محبت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبد العزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں۔ باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں۔ یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں اللہ تو ہی جانے میں مجبور ہوں..."[۱]

اس اقتباس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ محبت وعقیدت کو کوئی آئین نہیں ہوتا سید صاحب کے کسی تذکرہ نگار نے انہیں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب (ف ۱۲۳۹ھ) پر ترجیح نہیں دی لیکن مولانا رشید احمد جیسے ربانی عالم انہیں حضرت شاہ صاحب سے بھی بڑھا رہے ہیں جب حزب دہلوی کے مرکز میں محبت وعقیدت کا یہ انداز تھا تو پھر ایک مخصوص خطہ یا خاندان کو مورد عتاب بنانا کہاں تک بجا کہا جا سکتا ہے؟

یہاں تک تذکرہ تھا حضرت سید صاحب رحمہ اللہ اوان کے رفقائے کار کا اور مولانا سندھی کی تبویب کے مطابق حزب ولی اللہ کے دور اول کا۔

---

(۱) ارمغانِ احباب، معارف جلد ۴۳، ص ۳۴۴۔

(۲)

صادقین صادق پور اور عاملین بالحدیث پر کرم فرمائیاں

حضرت سید شہید رحمہ اللہ (ش ۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا سندھی ان کے اہل حدیث رفیقوں اور اہل صادق پور کے زیادہ شاکی ہیں۔ عام اہل حدیث رفیقوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ وہ افغان علاقے میں بھی عمل بالحدیث سے باز نہ آئے۔

''اب حزب ولی اللہ کی خصوصیات پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ نجدی ویمنی طریقوں پر کام کرنے والے ہندوستانی، حنفی فقہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے جس سے افغانوں کو مجاہدین سے مذہبی عداوت پیدا ہوگئی۔ امیر شہید رحمہ اللہ نے بارہا کوشش کر کے علماء افاغنہ اور عوام کو یقین دلایا کہ امیر اور ان کا خاندان ہمیشہ محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے۔ مگر حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیات تسلیم نہ کرنے والے لوگ اس پابندی کو قبول نہ کرتے اور معاملہ روز بروز بگڑتا گیا۔'' (ص ۱۵۹)

مصلحت وقت کے لحاظ سے ان عاملین بالحدیث کے ''اصرار'' (اگر انہوں نے واقعی حضرت سید شہید رحمہ اللہ کے سمجھانے کے باوجود عمل بالحدیث پر اصرار جاری رکھا) کے

متعلق جو کچھ کہا جائے پر امام ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کا نام لے کر تو ان پر زبان طعن کو دراز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ صاحب نے جو خاکہ بنایا تھا، اس پر سب سے پہلے خود ان کے پوتے ہی نے عمل درآمد شروع کر دیا تھا:

> ''جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جد امجد کے طریقے پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی، جو ''حجۃ اللہ البالغہ'' پر عمل کرتے، اور وہ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ سنن پر عمل کرتے تھے، اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم ان پر اعتراض نہیں کر سکتا۔'' (ص ۱۶۱)

جب صورت حال یہ ہے تو پھر آپ فقہ حنفی کی پابندی کو حزب ولی اللہ کی خصوصیات میں کیوں داخل کرتے ہیں؟ کہ کیا حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے مشرب کے مطابق ان جزئیات میں رواداری نہیں برتی جا سکتی؟

شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کی بابت ترک رفع الیدین کی روایت

اب صرف افغانی علاقے میں ''عمل بالحدیث'' کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ مولانا کی روایت ہے:

> ''جب افغانی علاقے میں ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ رفع یدین کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا، رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے، امیر شہید نے کہا کہ

مولانا! اب رضائے الٰہی کے لیے رفع یدین کرنا چھوڑ دیجیے۔

اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیے۔'' (ص ۲۔۱۶۱، بہ روایت امیر شاہ خاں رحمہ اللہ)

اولاً تو ہمیں اس شاذ روایت کے قبول کرنے میں تامل ہے۔[۱] مولانا شہید رحمہ اللہ کی تنویر العینین پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ تقلید کے دائرے سے نکل کر عمل بالحدیث کو اپنا شعار بنا چکے تھے۔ لیکن ہم صرف اس بنیاد پر روایت کی تکذیب نہیں کر سکتے، ہوسکتا ہے کہ اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے مصلحت وقت کی خاطر انہوں نے سید شہید کے مشورے سے رفع یدین وغیرہ ترک کر دیا ہو۔ یہ کوئی فرض و واجب کا سوال تو ہے نہیں، سنن و مستحبات میں عاملین و تارکین میں سے کسی کو بھی متشدد نہیں ہونا چاہیے اور جہاں تک خاکسار کی حقیر

---

(۱) ہندوستان میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت امیر شاہ خان کی اس روایت کو ''افک مبین'' قرار دیتی ہے۔ راقم نے صرف تامل ظاہر کیا ہے۔

ص،ی۔ نواب صدیق حسن خان نے ''اتحاف النبلا'' میں ایک فارسی فتوی بنام ''تنقید الجواب'' کا ذکر کیا ہے جو شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے املا کرایا تھا۔ یہ فتوی ایک حنفی عالم مولوی عبدالہادی کے فتوی عدم جواز رفع الیدین کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ اصل عبارت یہ ہے:

''تنقید الجواب فتوی فارسی عبارت است در جواب عدم جواز رفع الیدین فی الصلوۃ للشیخ المولوی عبدالہادی المہاجر الحنفی. از شیخ محمد اسماعیل بن عبدالغنی الشہید المتوفی سنۃ احدی و خمسین و مأتین و الف اوّلہ ''الحمدللہ الذی لاشریک لہ فی الخلق والامر، وآخرہ املاہ محمد اسماعیل عفااللہ عنہ'' وبروی دستخط مولوی عبدالحی مرحوم است بایں حرف ''ھذا املاء کلہ صریح الحق والحق احق بالاتباع''حررہ عبدالحی عفی عنہ شانزدہم ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ۔'' (اتحاف النبلاء،ص ۴۴) نواب صاحب کی اس تصریح سے واضح ہوجاتا ہے کہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی طرف ترکِ رفع الیدین کی نسبت قطعاً غلط ہے۔

معلومات کا تعلق ہے۔ امام ولی اللہ کا مسلک یہی تھا۔ امام ابن تیمیہ[۱] (ف ۷۲۸ھ) نے بھی اس پر بار بار زور دیا ہے۔

اہل حدیث علماء پر الزامات

لیکن حزب ولی اللہ کی تشکیل جدید کا دم بھرنے کے باوجود مولانا کا رویہ عاملین بالحدیث کے ساتھ منصفانہ نہیں، جس کی ایک جہاندیدہ وسیع النظر عالم سے توقع نہیں تھی، حیرت تو اس پر ہے کہ اس سلسلے میں غلط الزامات عائد کرنے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے، ملاحظہ ہو:

> ''مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علما کے شاگرد تھے، باز نہ آئے اور انہی لوگوں کے بیجا اصرار نے مشکلات پیدا کردیں، امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا۔ اپنی جماعت سے نکلوا دیا مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی۔''

---

(۱) ملاحظہ ہو: فتاوی ابن تیمیہ جلد دوم ص: ۳۸۷، ۵۷ ۳، مطبعۃ کردستان العلمیہ۔

بات پر بات نکلتی ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی مناسبت سے مولانا سندھی کی ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ وہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علم و فضل کے تو مداح ہیں، لیکن ان کے خیال میں امام کے لطیف نکتے اہل ہند کے دماغوں میں نہیں اتر سکتے، یعنی یونانی خرافات اور متکلمین کی پر پیچ باتیں تو یہ خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن قرآن و حدیث کی سادہ اور فطری سچائیاں ان کے ذہن و دماغ میں نہیں سما سکتیں، اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہو سکتی ہے؟ معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو اچنبھا نہ ہوتا مولانا کے الفاظ یہ ہیں، ''ہمارے اہل حدیث بھائی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دقیق مسائل سے حظ اٹھاتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ آیا یہ لطیف علوم ہندوستان کا متوسط طبقہ بہ آسانی قبول کرسکتا ہے؟ اس کے لیے عربی ذہنیت موزوں ہے۔'' (ص ۹۹)

مولانا عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ کی کردار کشی

نجدی اور یمنی علماء پر اطمینان سے گفتگو ہوگی، یہاں خاکسار صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہے کہ اہل حدیث عالموں کے جس رہنما کو مولانا زیدی شیعہ کہتے ہیں، وہ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی مہاجر مکی (ف ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ) ایک متبع سنت سلفی عالم ہیں، ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام عائد کرنا بڑا ظلم ہے۔ مولانا نے ان کا (ذکر خیر) مختلف جگہوں پر کیا ہے۔ دو موقعوں پر زیدی شیعہ، (ص ۱۹۵، ۱۶۲) اور ایک مقام پر نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف:۱۳۰۷ھ) کا استاذ بھی بتایا گیا ہے لیکن نام لینے سے احتراز رہا ہے۔ صرف ایک جگہ کتاب التمہید کے اقتباس میں ان کا نام آتا ہے۔

"...وانضم اليه الشيخ عبدالحق بن فضل الله البنارسی الذی ينتسب إلى الصدر الشهيد و أخذ عن الامام الشوكانی. (ص:۱۹۱)

''اور ان کے ساتھ (یعنی مولانا ولایت علی کے ساتھ) شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی مل گئے، جو مولانا اسمٰعیل شہید (صدر شہید) سے انتساب رکھتے ہیں، اور امام شوکانی کے (بھی) شاگرد ہیں۔''

یہی مضمون دوسری جگہ ایک اضافے کے ساتھ یوں ادا ہوتا ہے۔

''جس ہندوستانی عالم کو (جو مذہباً زیدی شیعہ تھا) امیر شہید نے اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا وہ بھی مولانا ولایت علی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ نواب صدیق حسن خان اسی استاد کے واسطے سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں...'' (ص ۱۹۵)

ہمیں نہیں معلوم کہ امیر شہید نے انہیں کب جماعت سے نکلوا دیا تھا، کیا اس کا کوئی مستند ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟

اب رہا شیخ عبدالحق بن فضل اللہ پر زیدیت اور شیعیت کا الزام اس کی حیثیت ایک بہتان سے زیادہ نہیں۔ دیکھئے کہیں ''مرغ قبلہ نما'' تو آپ کی ناوک افگنی کا نشانہ نہیں بن رہا ہے۔

مولانا عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ کی شخصیت

''مولانا عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ (۱۲۰۶ھ ۱۲۷۶ھ[۱]) علماء اہل حدیث اور شاہ اسماعیل و مولانا عبدالحئی کے تلامذہ میں سے تھے۔ طلب حدیث کے شوق میں سفر کیا۔ اور قاضی محمد بن علی شوکانی، عبدالرحمن بن احمد بن الحسن البہکلی، شیخ عبداللہ بن محمد بن اسمٰعیل الامیر الیمانی اور شیخ محمد عابد بن احمد علی السندی سے استفادہ کیا، اور حدیث کی عام اجازت حاصل کی۔'' (سیرت سید احمد شہید، طبع دوم، ص ۴۰۴، بحوالہ نزہتہ الخواطر قلمی)

تاریخی نام ''فضل رسول'' اور تاریخ وفات ''ففضل رسول'' آپ کے والد بزرگوار نیوتنی سے ترک اقامت فرما کر بنارس میں قیام پذیر ہوئے۔ اور یہیں کے ہو رہے... جیسے استاذ اور ہم سبق آپ کو ملے کب کسی کو نصیب ہوں گے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ'' کے حلقہ درس میں شہید علیہ الرحمہ کے شریک سبق ہو کر حدیث پڑھ رہے ہیں۔ امیر المومنین (حضرت سید احمد رحمہ اللہ) اور مولانا اسمٰعیل شہید ایسے قطبین کے ہمراہ زیارت حرمین سے مشرف اندوز ہوتے ہیں۔ دہلی سے تکمیل کے بعد یمن جا کر امام محمد بن (علی) قاضی شوکانی سے حدیث پڑھ رہے ہیں۔ سند و اجازہ بنفسہ امام شوکانی رحمہ اللہ سے حاصل

---

(۱) ان کی وفات ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ غالباً یہ کتابت یا طباعت کی غلطی ہے۔

ہے...جن کے درس میں قاضی شیخ محمد مچھلی شہری [۱] اور مولانا قاضی سید جلال الدین [۲] بنارسی ایسے اعلام محدث ہوں۔اس درس کی شہرت اور وسعت کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے...۔ (تراجم علمائے حدیث، ہندص ۴۴۴)

مولانا عبدالحق کی مظلومیت

یہ نوابوں کی روایت تھی،اب ذراتفریح کے لیے غیروں کی بنائی ہوئی کہانی بھی سنیے۔ اسے معلوم ہوگا کہ شیخ عبدالحق کی مظلومیت کوئی نئی نہیں۔اپنے شیخ حضرت سید شہید رحمہ اللہ اور استاذ مولانا شہید کی طرح یہ بھی غیروں کے حلقے میں نیک نام نہیں، جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما مسٹر اوکنلے (James Okinley) مولانا ولایت علی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

''ایک معلم کی حیثیت سے نمودار ہونے سے پہلے یہ (مولانا ولایت علی) بنارس کے ایک متعصب وہابی عبدالحق کے مرید [۳] ہوگئے تھے۔اس شخص کا اصلی نام غلام رسول (؟) تھالیکن وہابی تعلیمات اختیار کرنے کے بعد اس نے یہ غیر مذہبی نام ترک کردیا۔اور عبدالحق نام اختیار کیا۔اس کے بعد یہ مکہ گیا۔ جہاں اس کے مبتدعانہ خیالات کی خبر ترکی حکام کو ہوئی۔گرفتاری کا حکم صادر ہوا۔لیکن یہ کسی طرح نجد پہنچ گیا(؟) چند سال نجد میں رہ کر یہ

---

(۱) م:۱۲۵۲ھ،ف:۱۳۲۴ھ،تراجم علمائے حدیث ہندص:۳۷۳-۳۷۴۔

(۲) م۱۲۳۱ھ،ف:۱۲۷۹ھ)تراجم علمائے حدیث ہند۔ص ۳۴۵-۳۴۶۔

(۳) (اوکنلے کا مقالہ The Whabis in India مندرجہ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰۔۱۷ء مولانا ولایت علی شیخ عبدالحق کے مرید یا شاگرد نہیں تھے،البتہ دونوں ایک استاذ (مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ) کے شاگرد اور ایک شیخ (حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ) کے مرید تھے۔

بنارس واپس ہوا۔ جہاں یہ شیخ نجدی کے نام سے مشہور تھا۔مولوی ولایت علی اس کے اولین حلقہ بگوشوں (Converts) میں تھے۔''

ایک دوسرے صاحب اسی میں نمک مرچ لگا کر یوں خامہ فرسا ہیں:

''ایک بات اور بھی ہے جس میں ہندوستانی وہابی اپنے عرب بھائیوں سے الگ ہیں، یعنی یہ کہ سید احمد امام مہدی ہیں؟ ولایت علی (عبدالحق) کا ایک مرید نجد ہی میں وہابی ہو چکا تھا، لیکن بنارس میں رہتا تھا) نے اس عقیدے کی تبلیغ کی۔اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی۔[1]

مولانا عبدالحق کی اپنی تصریحات

اپنوں کی روایت کے ساتھ آپ نے غیروں کی ''تلبیس'' بھی دیکھ لی۔خود شیخ عبدالحق کی زبانی ان کے حالات وخیالات معلوم کیجیے۔نواب صدیق حسن خان صاحب (ف: ۱۳۰۷ھ) کو روایت حدیث کی اجازت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...وبعد فإن الشيخ الفطن... مولانا السيد صديق حسن نجل مولانا السيد اولاد حسن المحدث القنوجي... طلب مني اجازة عامة ومثلي منه يطلب و لست باهل ان اجاز فكيف ان اجيز و لكن الحقائق قد تخفى و قد من الله تعالى على بالمثول عند ائمة السنة النبوية و السماع منهم للآثار والاحاديث المصطفوية و اخذ الاجازات عنهم فاولهم و اجلهم الامام الهمام فخر الاسلام العالم الرباني

---

(۱) E-Rehatock کا مضمون (The history of the wahabis in Arabia and in India) مندرجہ جنرل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ممبئی جلد ۱۴، (۱۸۸۰ء) ص:۳۶۱''۔

مولانا قاضی محمد بن علی الشوکانی....[1] و قرأتُ اکثر کتب الحدیث علی اسوۃ المحدثین وارث علوم سید المرسلین العلامہ النبیل مولانا شیخ محمد اسماعیل الشہید تغمدہ اللہ بغفرانہ المدید و علیٰ شیخی[2] و مرشدی مولانا الشاہ عبدالقادر اعلیٰ اللہ درجاتہ و خصہ بہا و علی اکمل العلماء و افقہ الفقہاء قدوۃ المحدثین عمدۃ الکاملین الشیخ العلامۃ مولانا شاہ عبدالعزیز الدہلوی قدس اللہ سرہ بلطفہ الخفی والجلی... و اوصیہ بتقوی اللہ عزّوجل و اتباع الحق اینما کان و مع من کان والعمل بصحیح السنۃ و مجانبۃ البدعۃ والاستقامۃ علی قدم الحق والصدق... قالہ بفمہ و حررہ بقلمہ خادم السنۃ النبویۃ عبدالحق المحمدی... فی سلخ رجب سنۃ خمس و ثمانین و مائتین و الف الھجریۃ. (اتحاف النبلا. ص۵-۲۶۴)

(حامداً ومصلیاً) مولانا سید اولاد حسن محدث قنوجی کے صاحبزادے فاضل

---

(۱) اس کے بعد اپنے دوسرے شیوخ یمن وحجاز کے نام لئے ہیں جن میں امام عبداللہ بن محمد اسماعیل الامیر (ف:۱۲۴۲ھ-۱۸۲۶ء) عبدالرحمن بن احمد بن حسن بہکلی (ف، ـــــہ) زیادہ ممتاز ہیں (تفصیل کے لئے اتحاف النبلاء ص:۲۶۴)

(۲) شیخی و مرشدی کے فقرے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب (ف: ۱۲۴۳ھ) سے بیعت تھے، مصنف سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ نے انہیں سید صاحب کے خلفاء میں شمار کیا۔ (ص:۴۰۴)

لبیب مولانا صدیق حسن نے مجھ سے (روایت حدیث کی) عام اجازت مانگی۔ حالانکہ مجھ جیسا آدمی ان سے اجازت طلب کرتا اور میں تو اجازت دیے جانے کا بھی اہل نہیں چہ جائے کہ (میں خود) اجازت دوں۔ لیکن بعض اوقات اصلیت چھپ جاتی ہے اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے حقیر کو ائمہ سنت نبوی کی خدمت میں حاضری، ان سے حدیثیں سننے اور اجازتیں حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سب سے اول اور مقدم عالم ربانی، فخر اسلام امام اجل مولانا قاضی محمد بن علی شوکانی ہیں... میں نے حدیث کی اکثر کتابیں علوم نبوی کے وارث، اسوۂ محدثین، علامہ جلیل مولانا شیخ محمد اسماعیل شہید (تغمده الله بغفرانه المديه، اور اپنے شیخ و مرشد مولانا شاہ عبدالقادر (اعلیٰ الله درجاته و خص بها) اور علماء وفقہاء کے سرتاج، محدثین وکاملین کے سرخیل مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی (قدس الله سره بلطفه الخفی والجلی) سے پڑھیں... اور میں انہیں تقویٰ الٰہی کے ساتھ ساتھ اتباع حق کی نصیحت کرتا ہوں۔ حق جہاں بھی ہو، اور جس کے ساتھ بھی ہو اس کی اتباع کرنا چاہیے (اسی طرح) صحیح سنت پر عمل کرنے، بدعت سے بچنے اور حق و صداقت کی راہ پر ثابت قدم رہنے کی (نصیحت کرتا ہوں)... یہ (سب کچھ) سنت نبوی کے خدمت گزار عبدالحق محمدی نے اپنی زبان سے کہا اور (یہ سطریں) اپنے قلم سے لکھیں۔ مورخہ آخر (۲۹ / یا ۳۰ / رجب ۱۲۸۵ھ)

کیا اس ''اجازت نامہ'' کے بعد بھی ان پر ''زیدیت'' اور ''شیعیت'' کا الزام رکھا جائے گا؟ اگر اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی تھی تو اب دور ہو جانا چاہیے نجد و یمن کے مجتہد الفکر محقق سلفی عالموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا کوئی جرم نہیں۔ اور عبدالحق بنارسی تو علمائے یمن سے پہلے اساطین خانوادۂ ولی اللہ کے شاگرد اور کفش بردار ہیں۔ البتہ ان کی نظر

ہندوستان تک محدود نہیں اور اس طرح پر وہ مولانا سندھی کی اصطلاح میں انٹرنیشلسٹ ہیں، اور ہمارے مولانا کے ہاں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں۔ (۱)

امام شوکانی رحمہ اللہ پر زیدیت کا الزام

بہر حال شیخ عبدالحق کی زیدیت سے براءت کے لیے یہ اجازت نامہ کافی ہے، اگر کسی کو اس سے بھی اطمینان نہ ہو تو مزید ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن مولانا کا الزام خود قاضی محمد بن علی شوکانی (ف:۱۲۵۱ھ) پر ہے، وہ نیل الاوطار کے مصنف کو زیدی ہی سمجھتے

---

(۱) مولانا فرماتے ہیں: ...اس طرح حزب ولی اللہ کو ایک نیشنل پارٹی سمجھنا چاہیے جو انٹرنیشنل رجحان رکھتی ہے اور ان ہندوستانیوں کو جو نجدی، یمنی، ذہنیت رکھتے ہیں، ایسی پارٹی سمجھنا چاہیے، جو انٹرنیشنل نقطۂ نظر کو اساس قرار دیتی ہے۔ (ص ۱۶۳) ...مثلاً روس میں ٹروٹسکی کی جماعت انٹرنیشنل نظریہ رکھتی ہے، واضح رہے کہ ٹروٹسکی یہودی النسل ہے اس کے مقابلہ میں اسٹالن جو خالص روسی ہے، کی جماعت انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ سٹالین نے ٹروٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھی، قتل کرا دیا، اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے اور عربی ترکی ایرانی ہندی (یہ سب) نیشنل تحریکیں ہیں۔ ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے یا ایک ہندی جو اتحاد اسلام کی فکر رکھتا ہے تو یہ مثال ہوگی سٹالین کی، اور ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحاد اسلام کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی نجدی تحریکوں سے متاثر ہندوستانی، یہ ہے مثال ٹروٹسکی کی، کیوں کہ وہ بجز اسلام کے سب چیزوں کو نہیں مانتے۔ ہندوستانیت، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا ان ہر دو جماعتوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ (حاشیہ ص ۱۶۲-۱۶۳) جی چاہتا تھا کہ ٹراٹسکی اور اسٹالن کی تشبیہ پر کچھ عرض کروں، مگر طول کلام کے خوف سے رک گیا تو اب مولانا کی توجیہ کے مطابق ہمیں نجدی و یمنی تحریکوں سے متاثر ہندوستانیوں کی انٹرنیشنلزم ہی پسند ہے اور واقعی ہم اسلام کے سوا ''سب چیزوں'' کو نہیں مانتے اور ہمارے ہاں ہندوستانیت عربیت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہے، اب آپ چاہے اسٹالن کی طرح جلاوطن کر دیں یا پھانسی پر لٹکائیں، ہم تو اسلام اور اتحاد اسلام کی رٹ لگاتے ہی رہیں گے۔ یہ ایک ''سخن گسترانہ'' بات تھی جو ''مقطع'' کے بجائے حاشیے میں آ گئی۔ ورنہ ہمیں مولانا کی اس تعبیر و توجیہ سے اتفاق نہیں۔

ہیں۔[1] اور اہل صادق پور کی فرد جرم میں شوکانی سے تلمذ اور نجدی و یمنی تحریکوں سے ہم آہنگی بھی ہے۔ نجدی یمنی اور ہندوستانی تحریکوں کا باہمی تقابل ایک دلچسپ بحث ہے۔ اور مولانا سندھی نے ہندوستانی اور نجدی (اور اسی طرح ہندوستانی اور یمنی) تحریکوں کے فرق پر بڑی گہری اور نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ البتہ وہ نجدی اور یمنی تحریکوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے نزدیک دونوں بالکل ایک ہیں، جہاں تک روح کا تعلق ہے۔ ہندوستان کی تحریک جہاد و تجدید (یعنی حضرت سید صاحب رحمہ اللہ اور مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی تحریک) اور نجد و یمن کی دعوت توحید میں کوئی فرق نہیں مولانا عبید اللہ سندھی جیسا وسیع النظر اور دقیقہ رس عالم تقویۃ الایمان (مولانا شہید رحمہ اللہ) اور کتاب التوحید (شیخ محمد بن عبدالوہاب) کی تعلیمات میں صرف دو جزئی فرق نکال سکا ہے۔ (ص: ۱۳۶-۱۳۷) اسی طرح یمن کے سلفی عالم امام شوکانی رحمہ اللہ کی **ارشاد الفحول فی تحقیق الحق من علم الاصول** اور مولانا شہید رحمہ اللہ کی اُصول فقہ میں اجماع کی بحثیں ایک دوسرے سے مختلف نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔ اور مولانا سندھی نے اس اختلاف کو بڑے شد و

---

(۱) مولانا سندھی زیدیت اور شیعیت کا ذکر ایک ساتھ اس انداز میں کرتے ہیں، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ زیدیت اور عام شیعیت (اثنا عشریت) میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، اور یہ اس لیے کہ عقیدۂ غیبوبت (یعنی سید صاحب رحمہ اللہ کے عدمِ شہادت کا خیال) کا سلسلہ یمن اور شوکانی رحمہ اللہ سے ملایا جائے، حالانکہ زیدیت اور اثنا عشریت میں بڑا فرق ہے۔ ''امام منتظر'' کا عقیدۂ اثنا عشریت کا لازمی جزو ہے۔ زیدی تو حضرت زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (ش: ۱۲۲ھ۔ ۷۴۰ء) کو مانتے ہیں اور امامِ غائب کے قائل نہیں۔ (الملل والنحل شہرستانی، ص ۱۱۵-۱۱۸، طبع یورپ) اِس لیے بفرضِ محال امام شوکانی کو اگر زیدی مان بھی لیا جائے تو اس سے عقیدۂ غیبوبت کا سلسلہ یمن اور شوکانی سے نہیں ملتا۔ سید صاحب رحمہ اللہ کی غیبوبت کا خیال ہندوستان ہی کے خاص حالات کی پیداوار ہے۔ یہ عام مجاہدین کی ایک لغزش تھی، مغربی تحقیق کرنے والوں کی طرح خواہ مخواہ باہر سے سلسلہ ملانے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال غیبوبت کی بحث ابھی آگے آتی ہے، زیدیت و یمن کی بحث اپنی جگہ پر آئے گی۔

مد کے ساتھ بیان کیا ہے (ص ۱۳۸-۱۴۰) اگر ان جزئی اختلافات کے باعث نجد و یمن اور ہندوستان کی تجدیدی تحریکیں ایک دوسرے سے الگ کہی جا سکتی ہیں اور ان میں سے ایک کے لیے دوسرے کے ساتھ ارتباط قائم کرنا جرم قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر نجد و یمن کی تحریکوں کا ایک سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ نجد و ہند کی تحریکوں میں جتنا اختلاف ہے، اس سے کہیں زیادہ فرق علمائے نجد و یمن کے افکار میں ہے، جس کی تفصیل اس ضمنی بحث میں نہیں ہو سکتی۔ نجدی، یمنی اور ہندوستانی تحریکوں کا باہمی تقابل جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، ایک دلچسپ موضوع بحث ہے اور مستقل فرصت چاہتا ہے۔ آگے چل کر ان شاء اللہ اس پر مفصل گفتگو ہوگی۔

مولانا ولایت علی رحمہ اللہ پر عائد کردہ الزامات کا تجزیہ

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع پر آ جاتے ہیں۔ سید صاحب ان کے تذکرہ نگاروں اور شیخ عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ کے بعد مولانا سندھی کو زیادہ شکایت مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کے ہم مشرب اصحاب سے ہے۔ مولانا ولایت علی صادق پوری سے ہمارے مولانا خاص طور پر برافروختہ ہیں، اس کی وجہ خود ان کی زبان میں یہ ہے۔

"... کہ مولانا ولایت علی نے مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی" (ص ۱۱۲)

گویا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اولاً خود سید صاحب رحمہ اللہ ہی کی بیعت امارت، مولانا محمد اسحاق کی امارت مطلقہ کے خلاف بغاوت تھی (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) اب سید صاحب رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں نے بھی اپنا سلسلہ الگ قائم رکھا، اور انھوں نے مولانا محمد اسحاق کی دھلوی پارٹی (حزب دہلوی) میں شرکت نہیں کی، اور اسی کو وہ "انشقاق جماعت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

ا۔ انشقاق جماعت کا بے سر و پا الزام

"لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہ سے تعلق رکھتی تھیں، ان تمام جماعتوں نے الصدر الحمید کی رہنمائی پر اتفاق کرلیا تھا، بلکہ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ بالاکوٹ کی مصیبت عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی ہے۔ وہ ہے "**انشقاق الجماعة**" یعنی اس کے بعد حزب ولی اللہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گیا۔" (ص ۱۸۹۔ ۱۹۰)

اس انشقاق کا ذکر دوسری جگہ ایسے انوکھے انداز میں ہوتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، پڑھیے اور جی چاہے تو مولانا کے طریق فکر کی داد دیجئے:

"مشرقی مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے، چندر بنسی، سورج بنسی خاندان اسی مغربیت اور مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی، اور امیر شہید کے وقت میں بھی وہ بروئے کار آئی، امیر شہید مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں ان کے عامہ مریدین [1] بھی بہار وغیرہ کے ہیں، اس کے بالمقابل مغرب یعنی دہلی ہے، وہ لوگ دہلوی تحریک کو اپنا بنانا چاہتے ہیں، اسی لیے مولانا ولایت علی بہاری نے مولانا اسحاق کے خلاف دوسری جماعت تیار کی، وہ مولانا اسحاق اور حزب دہلوی کو اس میدان سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔ (ص ۶-۱۴۵ حاشیہ)

---

(۱) ہر ہر بات کی کہاں تک تردید کی جائے، لیکن مولانا کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے اثرات پورب ہی کے علاقوں میں محدود تھے یا یہ کہ پچھّم کے عوام وخواص پر ان کا اثر بہت کم تھا، حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے عقیدت مندوں کا حلقہ پورب اور پچھّم کو یکساں محیط تھا۔ دہلی، سہارنپور، مظفرنگر وغیرہ تو ان کے عقیدت مندوں کا مرکز تھے۔ (ملاحظہ ہو: ارمغان احباب از مولانا حکیم سید عبدالحئی رحمہ اللہ: معارف جنوری، جون ۳۹ء۔)

ذہانت کا کرشمہ

ذہانت بھی عجیب چیز ہے، مولانا عبیداللہ رحمہ اللہ کی ذہانت کی تعریفیں سنا کرتا تھا۔ آج اس کا مشاہدہ ہوا، کہاں چندر بنسی اور سورج بنسی رقابت؟ کہاں سید شہید کے خلیفہ خاص اور مولانا شہید و قاضی شوکانی کے شاگرد مولانا ولایت علی صادق پوری؟؟ یہ ذہانت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اولاً تو پارٹی بنانے اور ''انشقاق جماعت'' کا الزام بے بنیاد ہے، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مولانا محمد اسحاق (ف:۱۲۶۲ھ) اور مولانا ولایت علی (ف:۱۲۶۹ھ) کے درمیان فکر ونظر کا اختلاف مان بھی لیا جائے تو اس سے چندر بنسی اور سورج بنسی، دہلی اور بہار، پچھّم اور پورب کی رقابت کہاں ثابت ہوتی ہے،؟ یہ نسل اور زمین کی عصبیت تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی ہوگی، بات صرف اتنی ہے، کہ جب امت کی سرسبز امیدیں بالاکوٹ کی سرزمین میں دفن ہوگئیں اور چھوٹے بڑے سب پر نا اُمیدی چھا گئی، اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ساری جماعت تتر بتر ہورہی تھی، ایسے نازک وقت میں مولانا ولایت علی صادق پوری (جو سید صاحب کے خاص خلفاء میں تھے، اور انہی کے حکم سے ایک تبلیغی مہم پر دکن گئے ہوئے تھے) نے گرتے ہوئے علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور مرتے دم تک سید شہید رحمہ اللہ کی مہم کو چلاتے رہے۔ اُن کے بعد ان کے عزیزوں، رشتہ داروں، بھائیوں، بیٹوں، اور عام ماننے والوں نے جہاد فی سبیل اللہ کی مہم جاری رکھی اور اس کی ان کے خاندان والوں نے اتنی گراں قیمت ادا کی اور ایسی قربانیاں پیش کیں جن کا نمونہ ہندوستان کی کوئی اسلامی یا غیر اسلامی تحریک نہیں پیش کرسکتی، بس مولانا ولایت علی کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے سید صاحب رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر سنتے ہی دکن سے وطن کا رخ کیا اور مجاہدین کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور بکھرے ہوئے شیرازے کی تنظیم میں مصروف ہوگئے (۱۲۴۸ھ) اب اسے پارٹی بازی کہیے یا انشقاقِ جماعت، آپ کو اختیار ہے، ہم اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحب رحمہ اللہ

کی شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد مولانا محمد اسحاق گیارہ بارہ سال ہندوستان میں رہے (ہجرت: ۱۲۵۸ھ) اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیوں کے خلاف ان کی زبان سے کبھی ایک حرف نہیں نکلا۔

نیز مولانا سندھی ہی کا ارشاد یہ بھی ہے کہ مولانا محمد اسحاق نے ۱۲۵۷ھ کے لگ بھگ اپنا نیا پروگرام مرتب کیا:

''الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال کے غور وفکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کرلیا۔'' (ص ۱۷۷)

اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا ولایت علی نے ۱۲۴۸ھ میں اپنے ماننے والوں سے ازسرنو جہاد کی بیعت لی[۱]، تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا ولایت علی ۱۲۴۸ھ سے ۱۲۵۷ھ تک اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور مولانا محمد اسحاق کم از کم اس سے ناخوش نہیں تھے اور اس وقت تک منظم طور پر وہ خود کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے، بلکہ ہمارے پاس اس کا ثبوت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔[۲]

مزید برآں ہمارے مولانا اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حزب دہلوی اور حزب

---

(۱) والامیر ولایت علی انضم الیه عامة الشرقیین من البهار (؟) و بنغاله (؟) فام الی تجدید بیعة الجهاد بمحل اقامته صادق پور سنة ۱۲۴۸ھ (ص ۱۹۱)

(۲) مولانا ولایت علی کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم صادق پوری (مولود: ۱۲۵۲ھ متوفی ۱۳۴۱ھ) تذکرہ صادقہ میں رقم طراز ہیں:

''جناب مولانا ولایت علی نے شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ علیہ نبیرۂ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ دہلوی کی خدمت میں ترجمۂ قرآن از شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ اور رسائل مولانا اسماعیل شہید کے ارسال کی درخواست کی اور جناب شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارسال فرمانے پر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں ان کے طبع کرانے کی سعی فرمایا، بعد انکار صاحب مطبع آپ نے زمانہ دوروسیر بنگال کے اس خدمت طبع کو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزمان صاحب بردوانی کے حوالہ فرمایا چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے ایک ٹائپ پریس قیمتی وسنہرا خرید کر کے بکرات ومرات تعمیل ارشاد کیا...'' (ص:۱۱۶)

صادق پوری کی تفریق مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ہوئی۔

فهاجر الشيخ إلى الحجاز فتوفي في مكة سنة ١٢٦٢ھ و بعد ما توفي ظهر في المنتسبين إلى الطريقة الولي اللّٰهية الطائفتان الحزب الدهلوي والحزب الصادق بوري. (ص١٩١)

"تو شیخ حجاز ہجرت کر گئے اور مکہ مکرمہ میں وفات پائی (١٢٦٢ھ) اور ان کی وفات کے بعد طریقۂ ولی اللّٰہی پر چلنے والے دو فرقوں میں بٹ گئے، حزب دہلوی اور حزب صادق پوری۔"

تو پھر ان شہادتوں کی موجودگی میں مولانا ولایت علی رحمہ اللہ پر مولانا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنانے کا الزام کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے؟

اوپر کی تفصیل سے کم سے کم یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مولانا ولایت علی رحمہ اللہ نے مولانا اسحاق رحمہ اللہ کے مقابلے میں کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ لیکن ہمارے مولانا صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتے، وہ مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ سے لے کر مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ تک مختلف علماء ومشائخ کی مسلسل امامت وامارت ثابت کرنے کے لیے اہل صادق پور پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں اور کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ امام ولی اللہ دہلوی کے طریقے سے ہٹ گئے تھے، ان پر نجد کی وہابیت اور یمن کی زیدیت اثر انداز ہو گئی تھی اور حضرت شاہ صاحب کی حکمت کے اصلی وارث اور ان کی راہ پر ٹھیک ٹھیک چلنے والے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے شیوخ (اساتذہ) ہیں۔ ہمیں ان شیوخ[1] کے علم وفضل، تقویٰ وصلاح اور خدمات کا پورا پورا اعتراف ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ ان

---

(١) شاہ محمد اسحاق صاحب (ف: ١٢٦٢ھ) کے شاگرد حاجی امداد اللہ صاحب (ف: ١٣١٧ھ) ان کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (ف: ١٢٩٧ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (ف: ١٣٢٣ھ) اور ان تینوں کے شاگرد اور جانشین (ص: ١٨٦)، مولانا محمود الحسن شیخ الہند (ف: ١٣٣٩ھ) اور مولانا شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی۔ گو مولانا کو مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ (ص: ١٨٨)

حضرات کی سیاسی پالیسی صادق پوریوں اور سید شہید کے عام ماننے والوں سے مختلف رہی ہو، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ حق و رشد کا انحصار انہی شیوخ میں ہے اور ہندوستان میں دینی اصلاح انہی کی ذات کے ساتھ وابستہ رہی اور یہ کہنا یا سمجھنا کہ ان شیوخ کے دامن شفقت سے جو وابستہ نہ ہوا اس پر ہدایت کی راہ بند ہوگئی۔ ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

سلسلۂ کلام دراز ہوتا جارہا ہے۔ خاکسار یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ (ف ۱۱۷۶ھ) کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کے خاندان میں نظر وفکر کے دو مختلف رجحان نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تو فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب حنفی سے مقید نظر آتے ہیں۔[۱] اور شاہ عبدالعزیز صاحب (ف ۱۲۳۹ھ) کی زندگی ہی میں مولانا اسماعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) نے عمل بالحدیث کی طرح ڈال دی تھی۔ اور دادا کے بنائے ہوئے خاکے میں ہونہار پوتے نے رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا اور پھر تکیہ رائے بریلی کے سید زادے کی صحبت نے تو ان کے نظر وفکر کی دنیا ہی بدل دی، دوسری طرف شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) ہیں، جن کے پروگرام میں مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حنفی مذہب کی پابندی شامل ہے۔

---

(۱) واضح رہے کہ شاہ ولی اللہ کا مخاطب اعلیٰ طبقہ ہے۔ وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے۔ اس لئے ان کی باتیں دوسرے ممالک میں اسی طرح مانی جاسکتی ہیں۔ جیسے ہندوستان میں، مگر شاہ عبدالعزیز اعلیٰ طبقہ کو چھوڑ کر متوسط اور عوام کو مخاطب بنا کر وہی عالی علوم ان تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ علوم راسخ ہوسکیں، ظاہر ہے کہ متوسط طبقہ ہر ملک کا جدا جدا ہوتا ہے تو اب جو خصوصیات امام عبدالعزیز کے طریقے میں موجود ہیں، وہ صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے ہیں۔ علمی طور پر ان کو اس بلند فکری سے نیچے اترنے کی نمود اپنی طبیعت کی رو سے، نیز اپنے خصوصی ماحول (مثلاً خاندان، تلامذہ واولاد) کے رو سے کوئی ضرورت نہیں۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ اور شاہ عبدالعزیز فقط فقہ حنفی سے مقید ہیں'' (ص ۱۷۷/ حاشیہ)

الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال غور وفکر سے امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کرلیا، ان کے پروگرام کے دو اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(الف) حنفی مذہب کی پابندی۔

(ب) اور ترکی سلطنت سے اتصال۔ (ص ۱۷۸)

کون نہیں جانتا کہ مولانا شہید کی روش یہ نہیں تھی[۱]، مولانا خود فرما چکے ہیں[۲]، کہ مولانا شہید رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی تھی، جو آمین بالجہر اور رفع یدین وسنن پر عمل کرتی تھی۔ (اسی قسم کی ایک روایت آگے بھی آتی ہے)

تو کہنا یہ ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے مسلک سے ہٹے نہیں تھے، البتہ ولی اللہیوں میں مولانا شہیدؒ سے زیادہ متاثر ہیں۔ اور ان کے شاگرد بھی ہیں، اور ان کی ''خاص جماعت'' کے وہ رکن بھی تھے۔ خود مولانا سندھی کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

''... رائے بریلی میں مولانا شہید رحمہ اللہ سے حدیث پڑھتے اور آپ کی جماعت کے نائب تھے۔'' (ص ۱۱۴، بحوالہ سیرت سید احمد شہید رحمہ اللہ)

---

(۱) فرماتے ہیں:

ولیت شعری کیف یجوز التزام تقلید شخص معین مع تمکن الرجوع إلی الروایات المنقولة عن النبی صلی الله علیه وسلم الصریحة الدالة خلاف قول الامام المقلد الخ. (تنویر العینین)

''اور معلوم نہیں ایک شخص معین کی تقلید کا التزام کس طرح جائز ہوسکتا ہے جب کہ ایسی مرفوع (رسول اللہ سے منقول) روایتوں کی طرف رجوع ممکن ہے (یا ہو) جو اس امام خاص کے قول کے خلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں۔'' الخ۔

(۲) ابھی یہ پورا ٹکڑا اوپر شیخ عبدالحق کے سلسلے میں نقل ہو چکا ہے۔

"و مولانا ولایت علی کان من عظماء خواص اصحاب الصدر الشهيد و كان الامير الشهيد يرسله داعياً الى الجهاد فى الهند."

(مولانا ولایت علی صدر شہید کے اخص ترین اصحاب میں سے تھے اور امیر شہید انہیں جہاد کا داعی بنا کر ہندوستان بھیجتے تھے۔)

مولانا شہید رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد فقط حجۃ اللہ پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی جو رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتی تھی، مگر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحت عامہ کے لیے وہ جماعت ختم کر دی گئی، مولانا ولایت علی اس جماعت کے ممبر تھے، اب وہ علیحدہ[1] ہو کر دراصل اس جماعت کا احیاء، مقصد بتاتے ہیں۔ (ص ۱۹۲/حاشیہ)

پٹنہ کے مولانا ولایت علی رحمہ اللہ جو بالاکوٹ میں حاضر نہیں تھے وہ مولانا اسماعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے، جو مولانا شہید نے دہلی میں امام ولی اللہ کی اتباع کے لیے بنائی تھی۔ (ص: ۱۹۳ - ۱۹۴)

مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر حمید کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا، (ص ۱۹۴) اصلاحی فکر یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال، وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو یمنیوں اور نجدیوں کے خلاف جانتے تھے۔ (ص: ۱۹۴۔ حاشیہ)

یہ خود مولانا سندھی کے بیانات ہیں۔ ہمیں صرف یہ دکھانا تھا کہ مولانا ولایت علی پر انشقاق جماعت کا الزام غلط ہے، وہ ہمیشہ جادۂ ولی اللہی پر گامزن رہے اور اپنے لازوال کارناموں سے وہ اپنے شیخ حضرت سید شہید رحمہ اللہ اور استاد مولانا اسماعیل شہید کے سچے اور صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

---

(۱) کس سے علیحدہ ہو کر؟ مولانا شہید تو اپنے شیخ کے ساتھ بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرما چکے اب رہ کون گیا جس کے ساتھ تھے، اور اب علیحدہ ہو رہے ہیں۔

مولانا ولایت علی صادق پوری اور ان کے خاندان کی خدمات کا مختصر تذکرہ

یہاں تک تو صرف انشقاق جماعت پر گفتگو تھی، اب اس سلسلے کے دوسرے الزامات ومؤاخذات پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی صادق پوری کی خدمات ان کے مشن اور کام کی نوعیت پر مختصر سے مختصر طور پر کچھ صحیح معلومات بھی پیش کردی جائیں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے اس اعتراض وجواب کا پس منظر سامنے آجائے:

مولانا ولایت علی صاحب عظیم آباد ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے، مولوی فتح علی صاحب کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خان صاحب کے نواسے تھے، جو صوبہ بہار کے ناظم ورئیس اور عمائدین سے تھے۔ آپ نانا کے بڑے لاڈلے تھے... سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقریر سنی تو کیفیت بدل گئی، اب وہ عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے، بلکہ سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے رائے بریلی میں مولانا اسماعیل صاحب شہید سے حدیث پڑھتے اور آپ کی جماعت میں آپ کے نائب تھے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور سر پر لاد کر لاتے، اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے، مٹی گارے کا کام کرتے۔

سید صاحب کی جماعت میں آپ سے زیادہ مولانا اسماعیل صاحب شہید سے کوئی مشابہ نہ تھا، آپ سید صاحب کے رنگ میں ایسے رنگے اور آپ کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ اپنے سارے خاندان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا اور سید صاحب کا مخلص اور جانباز سچا نام لیوا بنا دیا، سید صاحب کے بعد آپ ہی

نے سب سے زیادہ آپ کی نیابت و جانشینی کا حق ادا کیا اور آپ کے خاندان نے سید صاحب کی محبت کی سب سے گراں قیمت اور سب سے بھاری تاوان ادا کیا، آپ کی ترغیب سے خاندان کے سب مردوزن خورد وکلاں، سید صاحب سے بیعت ہو گئے تھے، سید صاحب حج کو تشریف لے گئے تو آپ وطن میں نیابت انبیاء کے فرائض انجام دیتے رہے، پھر سید صاحب کے ہمرکاب جہاد کے لیے تشریف لے گئے سید صاحب نے آپ کو کابل سفارت پر بھیجا، ... سوات سے سید صاحب نے آپ کو اور مولانا سید محمد علی(۱) صاحب کو تبلیغ و اشاعت دین کے لیے ہندوستان روانہ فرمایا۔ مولانا ولایت علی پر آپ کی جدائی اور میدان جہاد سے علیحدگی بہت شاق تھی، سید صاحب نے آپ سے فرمایا کہ مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں، یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے۔ آپ وہاں سے بمبئی و حیدرآباد (دکن) آئے، ... آپ کو اسی اثناء میں بالاکوٹ کے حادثے کی اطلاع ہوئی سید صاحب کی خبر شہادت سے سارا بار آپ پر پڑ گیا، ... تمام ہندوستان میں سید صاحب کے حلقوں میں آپ کی شہادت سے ایک انتشار و پژمردگی چھائی ہوئی تھی، ... آپ نے بمطابق آیت **وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ**(۲) سید صاحب کے کام کو سنبھالا، وطن پہنچ کر تبلیغ دین و تنظیم جماعت کا کام شروع کیا۔

---

(۱) مولانا محمد علی رامپوری (ف: ۱۲۵۸ھ) سید صاحب کے چند ممتاز خلفاء میں تھے، حالات کے لئے سیرت احمد شہید (ص: ۲۶۳۔۳۵۸) اور سوانح احمدی (ص: ۱۵۰۔۱۵۵) کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

(۲) آل عمران: ۱۴۴ (اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ترے رسول ہی تو ہیں، آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے؟

لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی،... آپ ہی کی کوششوں سے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور شاہ اسماعیل صاحب کے رسائل (جوآپ نے شاہ اسحاق صاحب سے دہلی سے منگائے تھے) شائع ہوئے... آپ نے اپنے شیخ اوران کے مخصوص خلفاء کی طرح بیسیوں مردہ سنتیں زندہ کیں، اپنے ہاتھ سے خاندان میں متعدد بیواؤں کا نکاح کیا،... دو برس کے بعد آپ راستہ میں وعظ وتبلیغ فرماتے ہوئے حج کوتشریف لے گئے، حج وزیارت سے فراغت کے بعد آپ یمن تشریف لے گئے اور نجد و عسیر، مسقط، حضرموت کی سیر کی، اور قاضی محمد بن علی شوکانی سے حدیث کی سند لی، حج سے واپسی کے بعد مجاہدین کی طلب پر آپ نے اپنے بھائی مولوی عنایت علی صاحب کوگلاب سنگھ کے مقابلہ کے لیے سرحد بھیجا کچھ عرصہ کے بعد خودتشریف لے گئے... گلاب سنگھ نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا اوران کی حمایت حاصل کی، انگریزوں نے مفتوح ملک میں غدر کرادیا اورآپ کے عمال قتل کردیئے گئے، اس کے بعد آپ وطن لوٹنے پر مجبور کیے گئے لیکن انہیں واپسی کا بڑا رنج وملال تھا، آخر دو برس کے قیام کے بعد پھر ستھانہ پہنچ گئے، اور وہیں محرم ۱۲۶۹ھ میں علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

مولانا علیہ الرحمہ کا پورا خاندان صادق پور سید صاحب رحمہ اللہ کے سچے معتقدوں اوراسلام کے پکے مجاہدوں کا خاندان تھا، جس کا بچہ بچہ سید صاحب رحمہ اللہ کی محبت میں چوراوراسلام کے لیے سربکف تھا، ان لوگوں نے فرداً فرداً اور بحیثیت مجموعی سید صاحب کی وفاداری اوراسلام کی جان نثاری کا ایسا حق ادا

کیا جس کی نظیر کسی دوسرے خاندان میں نہیں ملتی، مولانا عنایت[1] علی غازی مولانا فرحت[2] حسین صاحب مولانا احمد اللہ صاحب[3]، مولانا یحییٰ علی[4] صاحب رحمہ اللہ میں سے ہر ایک اپنے وقت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا نمونہ تھا... یہ لوگ ﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي﴾[5] کے پورے مصداق تھے، مقدمہ سازش[6] میں حکومت نے ان کے مکانات مسکونہ تک مسمار کر دینے اور صادق پور کا وہ محلہ جہاں محل کھڑے تھے، کف دست میدان بنا کر اور مکانوں پر ہل چلوا کر میونسلپٹی کی عمارت بنوادی، جو آج تک قائم ہے، (البتہ زلزلے کے بعد دوبارہ تعمیر ہوئی ہے، لیکن Established 1865 تاریخ درج ہے) اور قدیم تعمیر کی ایک ایک یادگار اور ایک ایک نشان مٹا دیا، قبریں بھی مشتبہ کہہ کر

---

(۱) مولانا عنایت علی صاحب غازی (مولود: ۱۲۰۷ھ یا ۱۲۰۸ھ) کی وفات سرحد پار (منگل تھانہ) ایسے روح فرسا حالت میں ہوئی (۱۲۷۴ھ اور ۱۸۵۸ء) کہ دشمن بھی سن کر آبدیدہ ہو جائے۔ کوئی مصیبت نہ تھی جو اس مرد غازی نے خوشی خوشی برداشت نہ کی ہو۔ (تذکرہ صادقہ ص: ۱۳۰-۱۴۰) مولانا نے ان کے ابتلاء و محن کو بھی غلط معنی پہنائے ہیں، فاشکو ابی و حزنی إلی الله۔ ممکن ہے آگے کسی سلسلے میں ذکر آ جائے۔

(۲) مولود: ۱۲۲۶ھ متوفی: ۱۳۳۹ھ تفصیل کے لئے تذکرہ صادقہ (ص: ۱۴۱-۱۴۵)

(۳) اسیر انڈمان متہم مقدمہ سازش، پٹنہ ۱۸۶۵ء انڈمان ہی میں وفات پائی، ۱۲۹۸ھ۔ (تذکرہ صادقہ ص: ۴۴-۵۹)

(۴) اسیر انڈمان و متہم و مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ھ اسی "زندان" میں واصل بحق ہوئے: ۱۲۸۴ھ (تذکرہ صادقہ ۶۳-۷۸)

(۵) آل عمران: ۱۹۴ (سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا، اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیے گئے میری راہ میں)

(۶) مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء۔

کھود کر پھینک دی گئیں، حتی کہ کھجور کا ایک درخت رہ گیا تھا، جو اس چمن خزاں دیدہ کی یادگار تھا، اس کو بھی اکھڑوا دیا۔۔۔

(سیرت سید احمد شہید ص ۶۳۳-۲۷۳، ملخص [۱])

۲۔ اعتقاد غیبوبت کاالزام

مولانا ولایت علی صادق پوری پر انشقاق جماعت کے بعد دوسرا الزام اعتقاد غیبوبت کا ہے اور اسے مولانا سندھی نے بڑے شدومد کے ساتھ اچھالا ہے، بلکہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ان کا مرکزی فکر ہی یہی عقیدۂ غیبوبت تھا، اور اسی لیے وہ مولانا محمد اسحاق سے علیحدہ ہوئے، مولانا نے اس الزام کو بار بار دہرایا ہے، ہم صرف دو ایک اقتباس دیں گے۔

(۱) واقعۂ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہیں ملا، اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ سکھوں نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کرا دیا تھا۔۔۔ اس اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا، کہ ہو نہ ہو امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ (ص ۱۹۲)

(۲) ''بعض اتفاقی واقعات اس کے مؤید بن گئے، امیر شہید بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر اپنے اصحاب کو وصیت کرتے رہے ہیں، کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لیے ہم چند روز غائب ہو جائیں، تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں گے۔۔۔'' (ص ۱۹۳)

(۳) ''مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق صدر حمید کا اصلاحی فکر قبول نہیں کیا، اور اس روایت غیبوبت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ جس وقت الصدر الحمید دہلی سے حجاز پہنچ گئے، اس کے بعد مولانا ولایت علی نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔'' (ص ۱۹۴)

---

(۱) مزید تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو، تذکرۂ صادقہ (ص: ۱۱۰۔۱۳۰) اور سوانح احمدی (ص: ۱۵۵-۱۶۷)

(۴) اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصے کے لیے غائب ہو گئے ہیں، ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیے، وہ ضرور آئیں گے، اور انہی کی جماعت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔

(۵) بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول ہے، مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں، اس تحریک کی شمولیت میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے، اس لیے اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ عوام (نہ خواص) کو تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے یہ ایک سیاسی چال تھی۔ (ص ۱۹۵)

پہلے دو ٹکڑے تمہیدی ہیں، ان سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں، تیسرے اقتباس میں کچھ اضافوں کے ساتھ ''انشقاق جماعت'' والے الزام کو دہرایا گیا ہے، اس میں ایک فقرہ (روایت غیبوبت کی آڑ میں) مولانا ولایت علی کی دیانت داری اور خلوص نیت پر ایسا بدنما حملہ ہے جس سے ہم مولانا عبید اللہ کو اونچا دیکھنا چاہتے تھے، البتہ انشقاق جماعت کے متعلق ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ کے حجاز پہنچنے (۱۲۵۸ھ) کے بعد مولانا ولایت علی نے اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ اس کے متعلق دو حرف جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب کے ماننے والوں کی طرف سے ''پارٹی'' یا مستقل پارٹی کا اعلان کبھی نہیں ہوا۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا، رہی مولانا ولایت علی کی جہادی اور تنظیمی سرگرمیاں تو وہ دکن سے واپسی کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں (۱۲۴۸ھ) اسی سال سید صاحب کے ماننے والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تجدید کی (جیسا کہ اوپر گزر چکا) اس تجدید بیعت کے بعد مولانا اسحاق دس سال ہندوستان میں رہے، اور مولانا ولایت علی کی سرگرمیاں جاری تھیں، صرف پورب میں نہیں بلکہ سرحد پار بھی، تجدید بیعت

کے چند ہی سال بعد سید ضامن شاہ نے (جو گلاب سنگھ والی کشمیر سے برسر پیکار تھا) آپ سے مدد طلب کی، آپ نے اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی رحمہ اللہ کو بالاکوٹ بھیج دیا۔ اور وہ وہاں پہلے فتح یاب ہوئے (۱۲۵۴ھ-۱۸۳۸ء) پھر خوانین کی غداری سے بے یارومددگار ہوکر وطن واپس چلے آئے (تذکرہ صادقہ ص ۱۳۶) تو کیا مولانا محمد اسحاق کو ان سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی۔ پھر مولانا کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ مولانا اسحاق رحمہ اللہ کے حجاز پہنچنے کے بعد مولانا ولایت علی رحمہ اللہ نے اپنی پارٹی کا اعلان کر دیا؟ مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ کی دہ سالہ (۱۲۴۸ھ-۱۸۳۲ء۔ ۱۲۵۸ھ-۱۸۴۴ء) خاموشی اور رضامندی سے شاید ہمارے مولانا اپنی کمزوری محسوس کرتے ہیں، اسی لیے انہوں نے ''بعد از ہجرت'' کا شاخسانہ لگایا اور شاید اسی لیے ایک دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ ''کہ مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ کے احترام (اور خوف) سے وہ لوگ دہلی اوران کے اطراف میں صاف صاف اپنی تبلیغ نہیں کرتے تھے۔''[۱]

یہ دہلی اوراس کے اطراف کا ذکر ہے؟ بنگال سے لے کر کشمیر، سندھ اور سرحد پار تک ان کے مبلغین سرگرم عمل تھے، **وما یوم حلیمة بسرٍّ** (اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں)

اب مسئلۂ غیبوبت کو لیجیے جسے مولانا نے بار بار بڑے شد و مد کے ساتھ اچھالا ہے، حالانکہ یہ ایک وقتی چیز تھی، جس سے بعض طبیعتیں متاثر ہوگئی تھیں، اسے ''مرکزی فکر'' کہنا یا دعوت کی اساس بتانا مبالغہ آرائی سے کام لینا ہے۔

بات اتنی ہے کہ سید صاحب رحمہ اللہ کی شہادت سے مجاہدین کے جی چھوٹ رہے تھے۔ کسی نے یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ ''سیدنا'' شہید نہیں ہوئے، غائب ہوگئے ہیں، تھکے

---

(۱) کتاب التمہید میں ارشاد ہوا ہے:

لکن بسبب احترام الصدر محمد اسحاق ما کانوا یجاھرون بالدعوۃ فی دھلی و اطرافه (؟) (ص: ۱۵۱ بحوالہ کتاب التمہید)

ہارے اس پر یقین کر بیٹھے، اور کچھ دنوں تک اس کا غلغلہ رہا، بعد کو رفتہ رفتہ طبیعتیں سکون پر آئیں تو غلطی کا احساس ہوا، پھر اس میں صادق پور اور غیر صادق پور کی تفریق نہیں۔ سید صاحب کی غیبوبت کے عقیدے کا ظہوران کے محبین خاص کے تمام حلقوں میں ہوا۔ اہل صادق پور اس سے الگ نہیں تھے، اور یہ امر شدت محبت میں بہ کثرت ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس حال وقال سے ظاہر ہے جو وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت پیش آیا۔ خود دہلی اور سہارن پور کے نواح میں بھی اس کا غلغلہ رہا۔ اور تو اور مولانا کے حزب دہلوی (دیوبندی کے مرکز میں بھی اس کا چرچا تھا، اور اساطین ائمہ حزب دہلوی اس کے راوی ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ (ف ۱۳۴۱ھ) رقمطراز ہیں:

''اس کے بعد کچھ حضرت سید صاحب کے غیبوبت وظہور کا ذکر ہوا۔ ان سب لوگوں نے اس بے بضاعت سے پوچھا، میں نے کہا اس میں تو شک نہیں کہ سید صاحب رحمہ اللہ نے اس قسم کی پیش گوئیاں فرمائی تھیں۔ لیکن وقوع میں اب تک اشتباہ ہے، مولوی محمود حسن صاحب نے فرمایا، یہی ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا مسلک ہے، پھر انہوں نے نہایت معتبر ذریعے سے یہ قصہ سنایا۔ اور سب حاضرین نے اس پر اتفاق کیا۔

حدثنا الشیخ الصالح محمود حسن والحافظ احمد بن مولانا محمد قاسم والمولوی حبیب الرحمن وکلھم ثقة قالوا حدثنا شیخنا الثقة الصدوق الحجة مولانا رشید احمد گنگوھی حدثنا الشیخ الزاھد المتقی الاورع الحجة مولانا مظفر حسین الکاندھلوی قال سمعت من شیخنا و مولانا السید احمد عشرة امور وقعت منھا تسعة و بقیت واحدة وھو غیبوبته

وظهوره رحمة الله عليه والله اعلم.

”یعنی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی زبانی سنا وہ فرماتے تھے کہ ہم نے مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے سید صاحب کی زبان سے دس پیشین گوئیاں سنیں، نو ان میں سے واقع ہو چکی ہیں، اور ایک باقی ہے۔ وہ پیشین گوئی آپ کی غیبوبت اور ظہور کے بارے میں ہے...۔الخ الخ (ارمغان احباب: معارف جلد ۴۳ ص:۲۷۱)

جب مولانا مظفر حسین کاندھلوی (جو مولانا محمد اسحاق کے شاگرد اور مولانا سندھی کے حزب دہلوی کے ائمہ اولین اور دہلی بورڈ کے ارکان اربعہ میں سے ہیں، ص: ۱۸۲ - ۱۸۳ حاشیہ، ف ۱۲۸۳ھ) جیسے بزرگ روایت غیبوبت کے راوی ہوں، اور اس کا چرچا اہل علم کے دہلوی مرکز میں ہو تو پھر مولانا ولایت علی رحمہ اللہ اور اہل صادق پور پر یہ عتاب خاص کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان سے لغزش ہوئی۔ اور یہ فرط محبت کی لغزش تھی، اس خیال کو مرکزی فکر یا عقیدے کی حیثیت کبھی نہیں حاصل ہوئی۔ اور نہ وہ (معاذ اللہ) اس کے آڑ میں کوئی پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ اللہ کے برگزیدہ بندے اس سے بہت بلند اور ان کی سیرت ان چھچھوری باتوں سے پاک اور بے داغ تھی، افسوس یہ ہے کہ ہمارے مولانا اپنی وسعت نظر اور جہاں بینی کے باوجود، اہل صادق پور کے حالات وافکار سے بہت سرسری واقفیت رکھتے ہیں، جس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے۔

”جس تفصیل کے ساتھ ہم دہلوی (دیوبندی) پارٹی کے حالات جانتے ہیں، اس قدر (صادق پور) پٹنہ کی تحریک سے آشنا نہیں، تتمیم مبحث کے لیے ہم دوسری پارٹی کے مجمل حالات بیان کرتے ہیں۔“ (ص ۱۹۰)

اے کاش! کہ یہ مجمل حالات صحیح ہوتے۔

ہمارے مولانا کے ہاں تعارض بھی عجیب و غریب ہے، عقیدۂ غیبوبت کے متعلق ایک

جگہ (ص: ۱۹۵، اقتباس اوپر گزر چکا ہے) لکھا ہے کہ اس پارٹی کا مرکزی فکر یہی بتایا ہے، دوسری جگہ جزم کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔''

وکان الاصل السیاسی للصادق پور یین اعتقاد غیبوبۃ الامیر الشھید.''(ص:۱۹۱)

(عقیدۂ غیبوبت کو صادق پوریوں کے اصل مرکزی فکر کی حیثیت حاصل تھی)

اور تیسری جگہ ''کلمہ حق'' زبان سے نکل جاتا ہے:

''...مولانا ولایت علی نے ہندوستان کے مشرقی حصہ پر اپنا اثر قائم کر لیا اور افغانی پہاڑوں میں اپنا مستقل مرکز بنایا۔ ان کی اولاد اب تک اس علاقے میں اپنی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے، مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک چھوٹے پیمانے پر امیر شہید کی حکومت موقتہ کی یادگار ہے۔ ہمارا اپنا خیال مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق یہ ہے کہ وہ مولانا شہید کی اس خاص جماعت کو زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن خان جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔'' (ص:۱۹۶)

خط کشیدہ فقروں میں مولانا نے جو کچھ کہا ہے، اس سے زیادہ ہم بھی نہیں کہتے، البتہ اتنی ترمیم [۱] کے ساتھ وہ سید شہید رحمہ اللہ اور مولانا شہید رحمہ اللہ دونوں کی مشترک خاص

---

(۱) اس ترمیم کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ہمارے مولانا ولایت علی رحمہ اللہ تو محض آمین ورفع یدین والی اہل حدیث جماعت کا رہبر سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کے بعد کے جملے (اور اسی لئے (الخ)) سے مترشح ہوتا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔ مولانا ولایت علی سید صاحب رحمہ اللہ کی جماعت مجاہدین کے رہنما تھے، اوران کے خاندان کا مرکزی فکر صرف جہاد رہا۔ اہل حدیثیت تو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی ہے۔ ان میں سے اکثر اپنے کو حنفی مع القول بالترجیح کہتے تھے۔ مولانا عبدالرحیم تک یہی مسلک تھا۔ (دیکھو، تذکرہ صادقہ (ص: ۱۱۷-۱۱۹)

جماعت کو زندہ کرنا چاہتے تھے، اور اس میں وہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بڑی حد تک کامیاب ہوئے گو جان و مال کی بازی لگا کر نتیجہ کیا ہوا اسے نہ پوچھئے۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

غیبوبت سے متعلق دو حرف اور

مولانا کو صادق پور کے لٹریچر پر اطلاع نہیں، ورنہ انہی کی تحریروں سے اس کی جھلک [۱] مل جاتی اور نواب صدیق حسن خان صاحب (ف: ۱۳۰۷ھ) اور مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (ف: ۱۳۲۹ھ) کی شہادتوں کی ضرورت نہ پڑتی، مگر جب پیش کی جاچکی ہیں، تو ان کی چھان پھٹک ضروری ہے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جمع از عظیم آباد و بنگالہ در بارۂ سید احمد بریلوی مرحوم نیز ایں گمان کردہ اند، تا آنکہ بعض از مریدان ایشاں چہل حدیث دریں باب جمع مودہ وایشاں را مہدی وسط قرار دادہ قائل بغیبوبت ایشاں در جبال مغربیہ ہند شدہ منتظر عود بودہ اند وایں زَلّت عظیم است وکیف کہ سید مرحوم ایں دعویٰ نہ کرد وایما بہ عود نہ مودہ واگرمی کردہ ہیچ کس تصدیق نہ می نمود"۔ (ص: ۱۹۳ حاشیہ)

---

(۱) عقیدۂ غیبوبت کو اہل صادق پور کے ہاں کوئی ایسی اہمیت نہیں تھی کہ اس کی تبلیغ کی جاتی۔ ایک خیال تھا، جس سے کچھ دنوں تک بعض حضرات متاثر ہے۔ ان کے بعض رسالوں میں اس "تاثر" کا دھندلا سا نشان ملتا ہے۔

اربعین فی المہدیین

نواب صاحب (جنہیں مولانا سندھی رحمہ اللہ، مولانا ولایت علی کا ہم مسلک بھی بتاتے ہیں، ص:۱۹۶) کے اس بیان میں ایک بات تو بالکل بے بنیاد ہے۔ **الاربعین فی المھدیین** جس کا اوکنلے وغیرہ نے بھی ڈھنڈورا پیٹا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے۔[1] ہم نے اسے بار بار شروع سے آخر تک دیکھا کہ شاید کہیں سید صاحب کا نام آ گیا ہو، یا ان کی مہدویت کی تبلیغ کی گئی ہو، لیکن اس میں ایک حرف بھی ایسا نہ ملا جس سے نواب صاحب اور دوسروں کے عائد کردہ الزام کی تائید ہوتی ہو، یہ ''چہل حدیث'' کا ایک مجموعہ ہے، جس میں صرف خروج مہدی سے متعلق حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں، اس کے مرتب خود مولانا ولایت علی رحمہ اللہ صاحب ہیں، اور انہوں نے حدیثوں کے جمع کرنے کے سوا اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ شروع شروع بڑی حیرت ہوتی ہے، کہ نواب صاحب جیسے عالم کو ایسی جرأت کیوں کر ہوئی، لیکن جو لوگ ان کی زندگی کی الجھنوں سے واقف ہیں، وہ انہیں معذور رکھیں گے، دیکھئے تو کس انداز سے ''جمعے از عظیم آباد بنگالہ'' کہتے ہیں، گو یا مولانا اولاد حسین قنوجی (ف: ۱۲۵۳ھ) خلیفہ حضرت سید شہید رحمہ اللہ کے فرزند دل بند کو اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ روایت شہادت میں اختلاف کیوں کر پیدا ہوا؟ اور اس میں خود

---

[1] ہمیں بڑی تلاش ہے مولانا ولایت علی رحمہ اللہ کے نو رسالوں کا ایک مجموعہ (مجموعہ رسائل تسعہ) دیکھنے کے لئے ملا، اسی میں تیسرا رسالہ اربعین فی المہدیین ہے، ایک کالم میں اصل رسالہ ہے اور برابر کے کالم میں مولانا الٰہی بخش صاحب بڑاکڑی بہاری ف ۱۳۳۴ھ کے قلم سے اردو ترجمہ ہے۔ مطبع فاروقی دہلی میں چھپا تھا (تاریخ طباعت درج نہیں)

سید صاحب کے گھر والوں[۱] اور اہل قافلہ کا حصہ ہے یا نہیں؟ پھر چہل حدیث کے انتساب میں بعض از مریدان ایشاں کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مولانا ولایت علی مرحوم کی گود میں وہ کھیل چکے ہیں، اورانہی کی ترغیب سے نواب صاحب نے بلوغ المرام کی طرف توجہ کی اور شرحیں لکھیں۔ (تذکرہ صادقہ ص:۱۲۱/وسیرت والا جاہی جلد ۲ ص:۷ بحوالہ ابقاء المنن روض الخضیب ص:۱۶۲)

اصل یہ ہے کہ وہ حکومت کے سامنے اپنے کو عظیم آباد اور صادق پور سے بالکل بے تعلق دکھانا چاہتے تھے اور یہی ہو کر رہا[۲] اب رہ گئی، مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی کی تحریر، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

زعم اکثر العوام و بعض الخواص فی حق الغازی الشہید الامام الامجد السید احمد البریلوی رضی اللہ عنہ انہ المہدی المحمود (الموعود) و انہ لم

---

(۱) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں:
سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ جن سے قبل از معرکہ بالاکوٹ سید صاحب رحمہ اللہ نے اپنی غیبوبت کی پیشین گوئی کی تھی اور سید صاحب نے التر اقربا دریں قافلہ آپ کی غیبوبت کے قائل تھے مگر پنجاب اور ہندوستان کے اکثر آدمی پلۂ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔ (سوانح احمدی: ص ۱۳۷، نیز ملاحظہ ہو: سیرت سید احمد شہید ص: ۲۳-۲۳۳)

(۲) نواب صاحب کا حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، اہل نجد کی بھی کوئی برائی نہیں ہے، جو انھوں نے اپنی کتابوں میں نہ کی ہو، (اتحاف النبلاء ص:۴۱۳-۴۱۶، التاج المکلل، موائد العوائد وغیرہ) اور یہ صرف وہابیت سے براءت کے لئے، ورنہ وہ دل سے نجد کی دعوت توحید کے معترف اور ثنا خوان ہیں، (اتحاف، ص: ۸۴) کچھ یہی حال ان کا اہل صادق پور کے ساتھ ہے، ایک مرتبہ کلکتہ سے واپسی میں ملنے کی خواہش ہوئی تو دانا پور میں غلس کے وقت علمائے صادق پور کو آنے کی تاکید کی، کہ کراماً کاتبین کو خبر نہ ہو ملاقات ہوئی باتیں ہوئیں مگر اس حال میں کہ ہر آن رقیبوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ (بہ روایت مولانا عبدالغفار صادق پوری)

یستشهد فی معرکة الغز و بل انه اختفی عن اعین الناس وهو حی موجود فی العالم...(ص۱۹۸-۱۹۹)

(اکثر عوام اور بعض خواص امام امجد، غازی شہید حضرت سید احمد بریلوی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ مہدی موعود ہیں۔ اور وہ میدان جنگ میں شہید نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں اور وہ اب تک زندہ ہیں...۔)

''بعض الخواص'' پر مولانا سندھی نے یہ حاشیہ دیا ہے۔

قلت مراده من بعض الخواص الشیخ الجلیل الامیر ولایت علی المذکور دعا إلی هٰذه العقیدة دعوة حثیثة. (حاشیه ص۱۹۸)

(بعض خواص سے مشہور عالم امیر ولایت علی ممدوح مراد ہیں، جنہوں نے اس عقیدے کی سرگرمی کے ساتھ تبلیغ کی)

یہ مولانا کی زبردستی ہے، مولانا ولایت علی نے کبھی اس عقیدہ کی تبلیغ نہیں کی، سرگرمی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ ان کی دعوت صرف جہاد اور احیائے سنت کی تھی، مزید براں قرینے ایسے ہیں کہ مولانا شمس الحق (ف ۱۳۲۹ھ) کا اشارہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۵ھ) کی طرف ہو ہی نہیں سکتا، ہمارے شمس المحدثین کی پیدائش ۱۲۷۳ھ میں ہوئی، ان کا خاندان صادق پور سے کبھی کسی طرح وابستہ نہیں رہا۔ خود ان کی تعلیم و تربیت صادق پوری اثرات سے بہت الگ ہوئی، وہ مولانا بشیر الدین قنوجی (ف:۱۲۹۶ھ)[1] اور میاں صاحب سید

---

(۱) تراجم علمائے حدیث ہند (ص:۳۲۹) میں مولانا بشیر الدین قنوجی کا سال وفات ۱۲۷۳ھ بتایا گیا ہے، جو صحیح نہیں مولانا شمس الحق (مولود ۱۲۷۳ھ) ان کے شاگرد ہیں، نیز وہ نواب صدیق حسن خان صاحب کے دور میں بھوپال کے قاضی رہے ہیں۔

نذیر حسین محدث رحمہ اللہ (ف ۱۳۲۰ھ) کے شاگرد اور ہم مشرب تھے۔ غیبوبت کا عقیدہ یا خیال اگر کہیں تھا بھی، تو اندر اندر اور شمس المحدثین کے شباب تک تو وہ اندھی عقیدت ختم ہو چکی تھی، اور رہ گئی تھی تو بالکل برائے نام اور ایک محدود دائرے کے اندر، ان حالات میں ان کے لیے مولانا ولایت علی رحمہ اللہ (جو ان کی ولادت سے چار برس پہلے جان جان آفرین کو سپرد کر چکے تھے) کے خیالات کا پتہ لگانا بہت دشوار تھا، اس کے علاوہ ہمارے پاس ایسی زبانی شہادتیں ہیں [۱] جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عون المعبود کی مندرجہ بالا عبارت میں مولانا کا اشارہ اپنے ایک عظیم آبادی معاصر [۲] کی طرف تھا جو ایک جید حنفی عالم تھے، اور شمس المحدثین کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا عنایت علی غازی کے ابتلاء ومحن اور ان کی جماعت کی ابتری کو بھی مولانا سندھی عقیدۂ غیبوبت ہی کا شاخسانہ بتاتے ہیں، جس کی وجہ صرف لاعلمی ہے۔

ثم قام مقامه الامير عنايت على لكن ما حصل الاتفاق على الجهاد والقتال بل جلسوا منتظرين فتوفى سنة ۱۲۷۳ھ (۱۲۷۴؟) (ص:۱۹۱)

(پھر ان کی جگہ مولانا عنایت علی نے لی، لیکن جہاد وقتال پر اتفاق نہ ہو سکا، بلکہ لوگ منتظر بیٹھے رہے، (یعنی سید صاحب رحمہ اللہ کی واپسی کے) ان کا انتقال

---

(۱) ابھی مولانا شمس الحق مرحوم کے دیکھنے اور سننے والے بیسیوں اہل علم موجود ہیں جن میں سے بعض ممتاز حضرات کی خدمت میں اس خاکسار کو نیاز حاصل ہے۔ اور ان میں سے اکثر سے راقم نے اس موضوع پر گفتگو کی۔ اور ہر ایک نے اس بات کی تائید کی کہ شمش المحدثین کا اشارہ مولانا ولایت علی کی طرف نہیں ہو سکتا۔

(۲) غالباً ان کا نام مولوی محمد عظیم تھا۔ ہمیں جن بزرگ کے واسطے سے یہ روایت پہنچی، انہوں نے نام بتانے سے انکار کیا۔

۱۲۷۳ھ (؟) میں ہوا)

لکن حدث فی اصحاب الامیر عنایت علی جمع من المجاهدین مار افقوهم علی هذا الاصل بل مالوا الی الدهلویین. (ص۱۹۱)

(لیکن مولانا عنایت علی کی جماعت میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوگئے، جو اس عقیدے میں ان کے ساتھ متفق نہ رہ سکے، بلکہ ان کا رجحان دہلویوں کی طرف ہوگیا)

جس المناک واقعے کو مولانا نے عقیدۂ غیبوبت کا شاخسانہ بتایا ہے، اس کی اصلیت بھی معلوم کرلیجئے۔

''جب مولانا ولایت علی کا بماہ محرم (۱۲۶۹ھ) موضع ستھانہ ملک سوات میں انتقال ہوگیا، تو آپ (یعنی مولانا عنایت علی) منگل تھانہ سے وہاں واپس آئے، اور باتفاق تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی، اور جب تک سید اکبر شاہ کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران، سید مدار) نے فقراء مجاہدین کے ساتھ بے وفائی نہیں برتی وہیں قیام فرمایا، پھر بحالت مجبوری مع مجاہدین منگل تھانہ واپس آکر مسکن گزین ہوئے اور باقی زندگی قلیل مجاہدین کے ساتھ وہیں ختم کردی۔''

''۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پُرخطر تھی، شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا، املاک تہلکہ میں تھے، ... پھر کس کو ہوش تھا، اور کیوں کر ممکن تھا، کہ سرحد پار فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جاسکتا۔[۱] مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ

---

(۱) یہ وہ لکھ رہا ہے جو سرحد پار مجاہدین کے لیے روپیہ اور سامان فراہم کرنے والوں کا سرگرم شریک ومعاون تھا، یعنی مولانا عبد الرحیم صادق پوری برادر زادہ مولانا ولایت علی ومولانا عنایت علی متہم مقدمۂ سازش انبالہ و اسیر پورٹ بلیر۔

کردی، درختوں کی کوپلوں اور پتیوں پر اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی، اجابتیں خون آلود ہونے لگیں، آپ کے پاس جو نقود تھے، آپ مہاجرین و انصار پر صرف کر چکے تھے، اور وہ تھا ہی کیا، اونٹ کے منہ میں زیرہ، اب ادھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے ،زندگی تلخ تھی، یہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہو کر متی نصر اللہ پکار اٹھی تھی، مگر اس صبر و استقامت کے کوہ نے نہایت حلم و رضا مندی کے ساتھ اللھم بالرفیق الاعلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے بعارضۂ بخار وضیق النفس ۱۲۷۴ھ کے آخر میں (مطابق ۱۸۵۸ء) سجن المومنین سے جنت نعیم کو رحلت کی۔ "اللھم اغفر له وارحمه واحشره فی زمرة المهاجرین الذین هاجروا وجاهدوا مع نبیك محمد صلی الله علیه وسلم." (تذکرۂ صادقہ ص۔۱۳۷-۸)

ان روح فرسا حالات میں اگر مجاہدین انگریزی علاقہ پر کوئی حملہ نہ کر سکے، یا خود ان کی جماعت میں کچھ اختلال پیدا ہو گیا، اور امیر کی اطاعت سے کچھ لوگ منحرف ہو گئے، تو اسے غلط معنیٰ کیوں پہنائے جائیں؟

۳۔امام شوکانی رحمہ اللہ سے سندو اجازت حدیث

انشقاق جماعت اور مسئلہ "غیبوبت" کے علاوہ مولانا ولایت علی رحمہ اللہ کا ایک بڑا جرم یہ بھی ہے کہ انہوں نے نجد و یمن کی سیاحت کی اور امام محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ (ف ۱۲۵۰ھ) سے روایت حدیث کی سند و اجازت لی (ص: ۱۳۳-۱۹۱) ہم پہلے بھی بار بار کہہ چکے ہیں کہ بیرون ہند کے اہل علم سے استفادہ کرنا کوئی جرم نہیں اسلام اس قسم کی جغرافیائی حد بندیوں کا قائل نہیں۔خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (ف:۱۱۷۶ھ) نے

مدینہ منورہ میں شیخ ابوطاہر کردی مدنی (ف: ۱۱۴۵ھ) سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالحئی بڑھانوی (ف: ۱۲۴۳ھ) نے سفر حج کے موقع پر امام شوکانی رحمہ اللہ سے خط وکتابت کی اور ان کی تصنیفات حاصل کیں (سیرت سید احمد شہید، ص ۳۲۰) اور مولانا کی روایت کے مطابق (ص: ۱۸۴ حاشیہ) مولانا شہید نے بھی نجدیوں کے پاس اپنا نامہ بر بھیجا تو پھر مولانا ولایت علی ہی کیوں گنہگار قرار دیئے جائیں۔

رفض وتشیع کا الزام

ایک ضروری بات رہ گئی جسے آخر میں عرض کر دینا چاہتا ہوں مولانا نے ایک جگہ فخریہ لکھا ہے کہ ان کی دہلوی یا دیوبندی پارٹی اپنے نجدی ویمنی مخالفوں کو چھوٹا رافضی کہہ کر پکارتی تھی، پتہ نہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟ ہمیں اُمید نہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی (ف: ۱۲۹۷ھ) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (ف: ۱۳۲۳ھ) جیسے متورع عالم اپنے اہل حدیث اور غیر حنفی معاصروں پر ایسے الزام دھرتے ہوں گے، کم از کم راقم کی طبیعت اسے قبول نہیں کرتی، بہرحال حزب دہلوی (دیوبندی) کے ترجمان مولانا سندھی رقم طراز ہیں:

> ''مدرسہ دیوبند پہلی درس گاہ ہے جس نے مدرسہ دہلی کے بعد اس اصول پر کام شروع کیا دیوبندی نظام نے پچاس سال میں جس طرح کامیابی حاصل کی ہے، وہ اس تجدید کی صداقت کے لیے شاہد عدل ہے۔''

> اس نظام کو پختہ بنانے کے لیے عوام کو بتلایا گیا کہ جس قدر رہنما فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ حقیقت میں شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں، اس زمانے میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا، چھوٹا رافضی کہتا رہا ہے۔'' (ص: ۱۸۰-۱۷۸)

ہم نہیں جانتے کہ موجودہ دیوبندی نظام سے تعلق رکھنے والوں میں کتنے افراد مولانا

کے اس بیان سے اتفاق کر سکیں گے؟ بہر حال اتنا ہم جانتے ہیں، کہ ان کی بڑی تعداد:

ع سعدی از دست خویشتن فریاد

پکار اٹھے گی۔

اس پر ایک مختصر سا حاشیہ بھی ہے جس میں حضرت سید شہید رحمہ اللہ کو بھی اس گندگی میں شریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چھوٹا رافضی شاہ اسحاق رحمہ اللہ کے متبعین جس کو اس قسم کا پاتے، عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا رافضی ہے۔

یہ جملہ دراصل امیر شہید رحمہ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ مگر کثرت سے استعمال اس کا شاہ اسحاق کے متبعین نے کیا۔''

ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حضرت سید شہیدؒ پر ایک صریح بہتان ہے۔ سید صاحب اور ان کے مخصوص اصحاب کا کیرکٹر بہت بلند رہا ہے، اور ''کف لسان'' تو ان کی خاص خصوصیت رہی ہے۔

عما كان عليه الصدر الشهيد حدث الاختلاف الكثير بين(؟) العلوم والمعارف بين الحزبين...(ص۱۳۳)

''دونوں جماعتوں (حزب دہلوی اور حزب صادق پوری) کے علوم اور معارف میں بڑا اختلاف رونما ہو گیا''

ظاہر یہ، محدثین، حنابلہ نجد، گو تین لقب ہیں، مگر ان تینوں کے مصداق غالباً نجد کے حنبلی ہیں، اس لیے ہم پہلے یمن کے زیدیوں سے شروع کرتے ہیں، اس تحریر کے پڑھنے والوں کو غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ''بعض ائمۃ الصادقپوریین'' کا اشارہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کی طرف ہے۔ ان کا قصور یہ ہے کہ یہ سفر حج (۴۹-۱۲۴۸ھ) کے سلسلہ میں یمن ہوتے ہوئے قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) سے سند و اجازت

حدیث لے آئے تھے، جسے مولانا عبیداللہ معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ ہمارے مولانا کے نزدیک امام شوکانی قطعی طور پر زیدی ہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ اور زیدیت

صاحب نیل الاوطار کے علم وکلام کا انہیں پورا اعتراف ہے، لیکن تقلید کی جکڑ بندیوں سے آزادی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، بہرکیف شوکانی کے متعلق مولانا کی رائے سننے کے لائق ہے۔

...واشتغلت مالاستفادةمن کتبه مدة طویلة وانی معترف بان الله اعاننی بتلك التصانیف علی فهم طریقة المحقیقین لکن ما وافقت الشوکانی فی کثیر من مجتهداته والذی اعتقد فی حقه انه عالم منصف مجتهد فی الاصول والفروع، زیدی ینصر السنة. لکن لا یوافق اهل السنة الفقهاء ولا اهل الظاهر منهم فی جمیع مایقررونه. (ص:۱۳۹)

(اور میں ان کی کتابوں سے ایک عرصہ تک استفادہ کرتا رہا۔اور مجھے اس کا اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے ذریعہ مجھے محققین کے طریقے کے سمجھنے کا سلیقہ عطا کیا،لیکن بہتیرے اجتہادی مسئلوں میں ان کی مخصوص رائے سے اتفاق نہ کرسکا، اوران کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ ایک انصاف پسند عالم، اصول وفروع میں مجتہدانہ نظر وفکر رکھتے ہیں زیدی ہیں اور سنت کے حامی،لیکن تمام باتوں میں نہ تو وہ اہل سنت فقہیوں کے ہم نوا ہیں نہ ظاہریوں کے۔)

زیدیت کے سوا راقم کو اس ''چارج شیٹ'' کے حرف حرف سے اتفاق ہے، واقعی وہ

محقق ہیں اور اصول و فروع ہیں مجتہد بھی، "القول المفید فی ادلة الاجتهاد والتقلید" اور "ارشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الاصول" اس پر گوارہ ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ فقہ میں فقہاء اور ظاہریوں دونوں سے متعدد مسئلوں میں الگ رائیں بھی رکھتے ہیں "الدر البهيه" اور اس کی شرح "الدراری المضیئه" اس کی آئینہ دار ہیں، پر اس کے باجود وہ زیدی نہیں تحقیق مسلک اور مجتہدانہ نظر وفکر سے زیدیت تو لازم نہیں آتی، اور یہ ایسی روشن حقیقت ہے جسے ہر طالب علم جانتا ہے، لیکن جب ایک جہاں دیدہ عالم انہیں زیدی کہتا ہے، اور اس کی بنیاد پر قیاس وتخمین کے ہوائی قلعے [1] بھی تیار کرتا ہے.... تو پھر جانی بوجھی ہوئی چیز کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے، خاکسار کی یہ کوشش ہوگی کہ مختصر سے مختصر طور پر اپنی گزارشیں پیش کر دے۔

---

(۱) مولانا پہلے شوکانی کو زیدی کہتے ہیں، اس کے بعد ان کے ایک شاگرد (عبدالحق بنارسی) کو زیدی شیعہ کہتے ہیں، اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سید شہید کی غیبوبت کے مسئلے میں یہ شیعہ (عبدالحق بنارسی) اور شوکانی کا ایک دوسرا شاگرد (ولایت علی) پیش پیش تھے، گویا کہنا یہ چاہتے ہیں (گو صاف نہیں کہتے) کہ سید صاحب کی غیبوبت کا خیال شیعوں سے مستعار لیا گیا ہے، کہاں کہ بات کہاں پہنچا دی؟ یہ ہوائی قلعے نہیں تو اور کیا ہیں؟

لیکن بدقسمتی سے اس کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھی گئی، یعنی شوکانی پر زیدیت کا الزام اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اُسے مان بھی لیا جائے (جیسا کہ ہم نے کہیں اشارہ بھی کیا ہے) تو زیدیت سے غیبوبت کا عقیدہ کس طرح مستعار لیا گیا؟ زیدیت اور اثنا عشریت میں بڑا فرق ہے، امام غائب کا عقیدہ اثنا عشریوں کا جزو ایمان ہے، زیدی اس کے قائل نہیں یہ زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم ش: ۱۲۳ھ) کے پیرو ہیں، زیدیت کے متعلق تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (۱) توضیح المسائل العقلیہ از عماد الدین یحییٰ بن محمد بن حسن بن مسعود المقرائی الزیدی (من رجال القرن العاشر للہجرۃ) ورق ۲۴۔۲۷۔۳۰ الخ (۲) الملل والنحل (شہرستانی) ص:۱۲۱ و ص: ۱۱۵ لندن (۳) تحفہ اثناء عشریہ (شاہ عبدالعزیز صاحب ص ۷) نیز دیگر مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے حوالے کے لیے ملاحظ ہو، فہرست مشروح انگریزی، مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ جلد ۱۰ نمبر ۶۲۶، اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مضمون الزیدیہ (ص:۸-۱۱۹۶)

(۱) مولانا کے انداز بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں زیدی ہی زیدی ہیں، اور وہاں کسی متبع سنت عالم کا وجود وہ مستبعد خیال کرتے ہیں، لیکن یہ واقعہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔ یمن میں محقق اہلسنت علماء کا گروہ ہمیشہ اور ہر دور میں رہا ہے، ان کی تصنیفیں ''یمنی ایمان'' اور ''یمنی حکمت'' کے نمونوں سے بھری پڑی ہیں۔

یمن کے چند فحول علمائے اہل سنت

(الف) السید محمد بن ابراهیم بن عبدالله عز الدین المرتضی ابن الهادی ابن الوزیر صاحب العواصم والقواصم فی الذب عن سنة ابی القاسم. (ف:۸۴۰ھ)

ان محقق علمائے سنت کے سرخیل ہیں، علامہ ابن الوزیر کے ''تسنن'' میں تو شاید ہمارے مولانا کو بھی کلام نہ ہو، انہوں نے اپنی تصنیفات میں زیدیت سے صاف صاف براءت کی ہے، البتہ یہ دوسرے فقہی مذاہب کی تقلید سے بھی آزاد ہیں جسے شاید مولانا عبیداللہ پسند نہ کریں، یہ موقع طول کا نہیں تفصیلی حالات و افکار کے لیے ملاحظہ ہو: المعجم لابن فهد المکی (ف[۱] ۸۸۵ھ) ورق ۱۷۶۱، الف مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر: ۲۴۲۹، الضوء اللامع: جلد ۶ ص ۲۷۲، اتحاف النبلاء: ص ۴-۳۷۳، بروکلمن: ۲،۱۸۸، ذیل: ۲،۲۴۹ (نیز البدر الطالع: ۲، ۹۳-۸۱)

---

(۱) ابن فہد (ف:۸۸۵ھ) کی معجم چونکہ قلمی اور کمیاب ہے، اس لئے علامہ ابن الوزیر کے متعلق ان کا بیان نقل کردینا بہتر ہوگا:

وینتمی إلی مذهب اهل الحدیث کعادة الحنابلة شدید المیل الی السنة و یتظاهر بمذهب اهل السنة بخلاف اهل بیته و یجتهد فی أقوال الائمة و یختار ما رجح عنده دلیله...و الف مولفات مفیدة توزن بکثرة فضله... وا کثر من الرد علی الزیدیة الذین نقموا منه اتباع مذهب اهل السنة۔ (المعجم لابن فهد المکی (ورق:۱۷۶ او الف)

(ب) امام محمد بن اسماعیل الامیر الکحلانی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ) صاحب ''سبل السلام شرح بلوغ المرام''، زیدیت کی تردید میں ان کی ایک مستقل کتاب "**جواب اھل السنة فی نقص کلام الشیعه والزیدیه**" (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ نمبر ۱۱۸۵) موجود ہے، جسے پڑھ کران کے اتباع سنت کا جذبہ معلوم کیا جا سکتا ہے اور یوں ان کے عقائد وافکار کا سرسری اندازہ لگانے کے لیے ان کے مختصر رسالے، "**تطهير الاعتقاد عن أدران الالحاد**" کا مطالعہ کافی ہوگا، جس کا لہجہ تقویۃ الایمان سے بھی زیادہ سخت ہے، البتہ تقلید کے یہ بھی دشمن ہیں اور سخت، حرم میں چار مصلوں کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"...ما احدث فيه (الحرم) بعض ملوك الشراكسة الجهلة الضلال هذه المقامات الاربعة التى فرقت لعبادات العباد واشتملت على مالا يحصيه الا الله من الفساد. (تطهير الاعتقاد مطبع المنار ۱۳۴۰ھ)

''... یہ جو بعض جاہل گمراہ کن چرکسی فرمانرواؤں نے حرم میں عبادت کے لیے چار مقامات الگ الگ کر دیے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس تفریق میں (جو گویا بندوں کی پرستش کے لیے ہوئی ہے) فتنہ وفساد کے کتنے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔''

تردید زیدیت میں امام شوکانی رحمہ اللہ کی مستقل کتابیں اوران کے عقائد

(۲) انہیں دونوں بزرگوں کی طرح امام محمد بن علی شوکانی (المولود ۱۱۷۲ھ، المتوفی ۱۲۵۰ھ) بھی محقق سلفی عالم ہیں، علامہ ابن الوزیر اور امام محمد بن اسماعیل الامیر کی طرح

انہوں نے بھی زیدیت کی جابجا تردید کی ہے، اصول وفروع زیدیہ کی تردید میں مستقل رسالے لکھے ہیں، ان کو زیدی کہنا حق وصداقت کا منہ چڑھانا ہے، شواہد ملاحظہ ہوں:

الف) زیدی عقائد میں معتزلہ سے قریب ہیں، اور اپنے کو اہل العدل والتوحید کہتے ہیں، ''اکثر زیدیہ درفروع موافق مذہب حنفیہ اند و در صول مطابق اعتقاد معتزلہ''۔ (تحفہ اثنا عشریہ: ۱، ص: ۷ وغیرہ)

امام شوکانی عقائد میں ٹھیٹھ سلفی ہیں، ان کا مختصر رسالہ ''التحف فی مذاهب السلف'' اس پر سند ہے۔

(ب) زیدی فروع میں ایک خاص مسلک رکھتے ہیں، اور حنفیہ سے قریب ہیں، امام نے ان کے مخصوص مسائل کی تردید میں متعدد رسالے لکھے ہیں:

(i) ''السیل الجرار المتدفق علی حدائق الانہار'' میں زیدیہ کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ''الازھار فی فقه الائمة الاطھار'' کا کھرا کھوٹا الگ الگ کر دکھایا ہے، الازہار امام احمد بن یحییٰ ابن مرتضی عدین مرتضی بن مفضل (ف ۸۴۰ھ) کی تصنیف ہے، اور فقہ میں اہل یمن کا مرجع و ماویٰ ہے، علمائے یمن نے اس کی بیسیوں شرحیں لکھی ہیں، خود مصنف نے الغیث المدراء کے نام سے چار جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے۔ (تاریخ المین بعید الواسع الیمنی ص: ۴۲، بردکلن ۳، ۱۸۷، ذیل ۳، ۵۔ ۲۴۴) اسی الازہار کی تنقید کی وجہ سے ضعاء میں شوکانی کے حامیوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان سخت ہنگامہ برپا ہوا۔

''...وثارت من اجل ذلك فتنة فی صنعاء الیمن بین من هو مقلد و بین من هو مقتد بالدلیل تو هما من المقلدین أنه ما اراد الاهدم مذهب اهل البیت لان الأزهار هو عمدتهم فی هذه الاعصار...''(حسین

بن محسن[۱] السبعی نیل الاوطار، ج:۱،ص:۱۰)

اوراسی وجہ سے صنعاء (یمن) میں مقلدوں اوردلیل وحجت پر عمل کرنے والوں کے درمیان بڑا ہنگامہ ہوا، مقلد یہ سمجھے کہ یہ (شوکانی) اہل بیت کا مذہب ختم کرنا چاہتے ہیں، چونکہ پچھلی صدیوں میں الازہار ہی پران کا تکیہ رہا ہے۔

نواب صدیق حسن خان صاحب نے بھی غالباً اسی فتنے کی طرف اشارہ کیا ہے، ''زیدیہ'' سبب روبرمذہب ایشان تعصب تمام یہ وہ بارہا بصورت بلوی برآمدہ خانہ، اور امحاصرہ کروند، چون وے یکبا ر ازخانہ برآمد ہمہ بگر یختند، الخ'' (اتحاف النبلاء ص ۴۰۹)

(ii) الصوارم الهنديه اللسلولة على الرياض الندية۔

زیدیہ وضوء سے پہلے غسل فرجین کے قائل ہیں، اور یہ ان کے نزدیک وضو کے ارکان میں داخل ہے، اسی کی تردید میں یہ رسالہ ہے۔

(iii) تشنيف السمع بابطال أدلة الجمع زیدیہ حضر میں بھی جمع صلاتین کے جواز کے قائل ہیں، قاضی شوکانی نے تشنیف السمع میں اس کی تردید کی ہے، زیدیہ کی تردید میں ان کے اور بھی رسالے ہیں، جن کا استقصاء یہاں مشکل ہے۔

(ج) ''الدر النضيد فى اخلاص كلمة التوحيد'' امام شوکانی کا ایک چھوٹا سا توحیدی رسالہ ہے جس کے مضامین تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید سے ملتے جلتے ہیں، اور تشدد کا بھی وہی انداز ہے، جزئی اختلافات کا تذکرہ آگے آئے گا، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) کی طرح[۲] انہوں نے نے بھی اس رسالے میں قصیدہ بردہ

---

(۱) نیل الاوطار ج ۱/ (مطبوعہ مصر ۱۲۹۷ھ) کے آغاز میں (ص: ۱۴-۹) حسین بن محسن السبعی الانصاری (ف: ۱۳۲۷ھ) کے قلم سے مصنف نیل کا ترجمہ درج ہے یہ ٹکڑا انہوں نے عبدالرحمن بن احمد السبکی تلمیذ شوکانی کی کتاب (نفع العود فی ایام الشریف جمود) سے نقل کیا ہے۔

(۲) کتاب التوحید ص: ۶۷ مطبوعہ باہتمام شرف الدین واولادہ الدار لنضید ص: ۲۹ مصر ۱۳۴۳ھ۔

کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے:

یا اکرم الخلق مالی من الوذبه
سواك عند حلو ل الحادث الجسم

(اے مخلوقات میں سب سے زیادہ بزرگ مصیبتوں کے عالم میں آپ کے سوا میرا کون ہے جس کے دامن کی پناہ لے سکوں۔)

(د) شوکانی حدیث کے باب میں خالص اہل سنت کا مسلک رکھتے ہیں، اور صحیحین کو وہی درجہ دیتے ہیں، جس کی یہ مستحق ہیں، "تحفه الذاکرین"[1] کے تمہیدی مقدمے میں لکھتے ہیں:

"...واعلم ان من كان من احاديث هذاالكتاب فى الصحيحين فقد اسفر صبح الصحة لكل ذى عينين لانه قد قطع فيها عرق النزاع ماصح من الاجماع على تلقى جميع الطوائف الاسلامية لما فيها بالقبول و هذه رتبة فوق رتبة التصحيح عند جميع اهل المعقول والمنقول. (دیباچہ)

"واضح رہے کہ اس کتاب کی جو حدیثیں صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) میں ہیں تو ان کی صحت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی ہے، اس لیے کہ ان کی قبولیت پر تمام اسلامی جماعتوں کا اجماع ہو چکا ہے، جس نے ان کے باب میں کسی اختلاف کی گنجائش ہی نہیں باقی رکھی ہے اور تمام اہل معقول ومنقول کے نزدیک یہ تصحیح کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔"

اب ہمیں بتانا چاہیئے کہ کوئی زیدی صحیحین کو غیر مشروط طور پر قبول کرسکتا ہے؟ نرم سے

(۱) ابن اثیر جزری (ف: ۸۳۳ھ) کی حصن حصین کی شرح شوکانی نے تحفۃ الذاکرین کے نام سے لکھی ہے۔

نرم زیدی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضیلت اور استحقاق خلافت سے دست بردار نہیں ہوسکتا، اور صحیحین کے تسلیم کرنے سے اس عقیدے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ (۱)

امام شوکانی رحمہ اللہ اور حجیت اجماع

یہاں تک امام شوکانی کی زیدیت پر گفتگو تھی، لیکن مولانا کو اس سلسلہ میں یمن کے اس نامور عالم سے ایک اہم شکایت ہے، اچھا ہو کہ آپ انہی کی زبان سے سنیے:

''یمنی تحریک کے ایک بزرگ امام شوکانی محقق محدث ہیں، اور حزب ولی اللہ کے اتباع میں سے بعض فرقے مستقل طور پر ان کی اتباع کا دم بھرتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں، کہ اتباع سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شوکانی حزب ولی اللہ کا مساہم ہے۔ مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ شوکانی زیدی ہیں اس لیے حنفیہ سے گو بعض مسائل میں اشتراک ضروری ہے۔ پھر بھی وہ محبت اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے، قاضی شوکانی کی کتاب ''ارشاد الفحول'' اور مولانا شہید کا رسالہ ''اصول فقہ'' ملا کر پڑھیے۔ تو فرق واضح ہو جائے (۲) گا۔''

اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ شوکانی حجیت اجماع پر صاف رائے نہیں رکھتے، لیکن مولانا اگر اس اعتراض کو یوں ادا کرتے کہ اجماع کے مسئلے میں شوکانی حنفیہ کے ہم خیال نہیں تو زیادہ صحیح ہوتا، اور یہ کوئی وجہ شکایت نہیں جب آپ انہیں مجتہد فی الاصول والفروع مان

---

(۱) مثال کے طور پر صحیح بخاری میں باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد کے ابواب (ج ۳ ص ۱۹۹) اور اس کے بعد، مطبع شرقیہ، مصر ۱۳۰۴ھ) سے کوئی زیدی (کتنا ہی روادار کیوں نہ ہو) اتفاق نہیں کر سکتا۔

(۲) مولانا نے دونوں کتابوں سے اقتباسات دے کر اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ہمیں رسالہ اصول فقہ اور ارشاد الفحول'' کے نقطہ ہائے نگاہ کے اختلاف سے انکار نہیں، لیکن مولانا نے ارشاد الفحول کا صرف وہ ٹکڑا نقل کیا ہے، جہاں شوکانی نے عام اجماع کی حجیت سے انکار کیا ہے۔ (ص: ۴۰-۱۳۹)

چکے تو پھر آپ انہیں اپنے خاص مسلک کا پابند کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ اجماع کے باب میں یہ کوئی نیا اختلاف نہیں، اجماع کی تعریف (حدورسم) ارکان، شرائط کس میں سخت سے سخت اختلافات نہیں، حنابلہ اور اہل ظاہر صرف اجماع صحابہ کو مانتے ہیں خود امام احمد بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) سے دو روایتیں ہیں، مشہور روایت تو یہی اجماع صحابہ کی صحت اور حجیت کی ہے جس پر حنابلہ کا عمل درآمد ہے، دوسری روایت کے مطابق وہ اجماع کا وجود ہی نہیں تسلیم کرتے، (من ادعی الاجماع فھو کاذب) امام شوکانی کا رجحان بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق اجماع (یعنی الاجماع العام فی کل عصر) کی حجیت ان کے نزدیک مسلم نہیں۔ اور جہاں جہاں انھوں نے حجیت اجماع پر اعتراض کیے ہیں، وہاں یہی (اجماع عام فی کل عصر) مراد ہے، باقی رہا اجماع صحابہ تو اس کے وہ منکر نہیں،

(البحث السابع) اجماع الصحابة حجة بلاخلاف و نقل القاضی عبد الوھاب عن قوم من المبتدعة ان اجماعھم لیس بحجة و قد ذھب الیٰ اختصاص حجیة الاجماع باجماع الصحابه دا ود الظاھری وھو ظاھر کلام ابن حبان فی صحیحه و ھذا ھو المشھور عن الإم احمد بن حنبل... وقال ابو حنیفه اذا جمعت الصحابة علیٰ شئی سلمنا و اذا أجمع التابعون زاحمناھم.

(ارشاد الفحول:ص ۷۷)

ساتویں بحث، صحابہ اجماع بالاتفاق حجیت ہے، قاضی عبدالوہاب نے مبتدعین کی ایک جماعت کی یہ رائے نقل کی ہے ان کے نزدیک اجماع صحابہ حجت نہیں، اور داود ظاہری اجماع کی حجیت کو اجماع صحابہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، اور ابن حبان نے صحیح میں جو کچھ لکھا ہے ظاہر اس کا منشاء یہی معلوم ہوتا

ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ''جب صحابہ کا کسی مسئلے پر اجماع ہوگا، ہم اسے تسلیم کریں گے۔ اور تابعین کے اجماع میں ہم کلام کریں گے۔''

اس اقتباس سے امام شوکانی کا رجحان [1] نمایاں ہے، پھر بھی ہمارے مولانا انہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، اب تک تو حجیت اجماع پر ان کی رائے صاف نہیں تھی، لیکن آگے چل کر وہ انہیں خود بخود حجیت اجماع کا منکر قرار دے کر شیعیت (زیدیت نہیں) کی تعریض سے بھی دریغ نہیں کرتے:

> ''حجیت اجماع پر مدار ہے صدیق اکبر کی خلافت کا مصحف عثمان کے متبوع ہونے کا ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے عوض جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں، آج جس چیز کو جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ کہا جاتا ہے، وہی اس زمانہ کا اجماع ہے، اس کی حجیت کے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے، مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے...۔''

اہل انصاف غور کریں کہ یہ (شیعیت) کی تعریض کہاں تک حق بجانب ہے؟؟ رہا یہ کہ جمعیۃ مرکزیہ کا فیصلہ کہاں تک اجماع کا منشاء پورا کرتا ہے؟ سر دست ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔

---

(۱) پوری مفصل بحث کے لئے إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الاصول (ص۸۷-۸۶) مطبعة السعادة مصر، ۱۳۲۷ھ) کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(۳)

''نجدی'' اور ''یمنی'' تحریکوں کا شوشہ

ہمارے مولانا نے نجدی اور یمنی تحریکوں کا بار بار نام لیا ہے یمنی تحریک سے ان کی مراد غالباً امام شوکانی کا مخصوص مسلک ہے جس کے متعلق مختصر طور پر عرض کیا جا چکا ہے۔ ورنہ ہمیں کسی یمنی تحریک کا حال معلوم نہیں جس سے حضرت سید شہید کے ماننے والے متاثر ہوئے ہوں اور اسے تحریک کہا جا سکے اور سچ پوچھئے تو مولانا عبید اللہ کی زیر نظر کتاب سے پہلے اس مخصوص انداز میں یمنی تحریک کا نام بھی نہیں سنا گیا تھا۔

البتہ نجدی تحریک مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر بہت مشہور اور بدنام بھی ہے بدقسمتی سے سید صاحب کی دعوت تجدید و جہاد کی طرح یہ تحریک (اگر اسے تحریک کہنا صحیح ہو) بھی غیر تو غیر اپنوں میں بھی نہیں سمجھی گئی اور خوش عقیدہ لوگوں میں اب تک موحدین نجد کے متعلق ایسے خیالات پائے جاتے ہیں کہ پڑھ کر اور سن کر حیرت ہوتی ہے افسوس کہ یہ موقع اس تحریک پر بحث و نظر کا نہیں اور راقم اس موضوع پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ لکھ بھی چکا ہے، (ملاحظہ ہو، سیرت محمد بن عبد الوہاب کا پہلا باب) اس لیے یہاں مختصر سے مختصر لفظوں میں اپنا مدعا پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

نجدی تحریک کی مختصر حقیقت

نجدی تحریک، یا شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی (۱۱۱۵ھ ۱۲۰۶ھ) کی دعوت توحید کا محور صرف وہ دو مقدس چیزیں ہیں جنہیں ہم کتاب و سنت کے نام سے یاد کرتے ہیں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کے معاصر ہیں اور دونوں بزرگوں نے دو چار سال آگے پیچھے مسجد نبوی میں تعلیم حاصل کی ہے دونوں وقت کے ناگفتہ

بہ حالات سے متاثر ہوئے، ملاحظہ ہو(الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اول ص ۳۹۔۴۰)اور ملتی جلتی راہ اختیار کی یعنی دونوں نے دین مبین کو بدعتوں اور توہمات کی آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی کتاب وسنت کے چشمہ صافی کی طرف دعوت دینے میں بھی دونوں شریک وسہیم ہیں، تقلید جامد کے بندھنوں کے توڑنے میں دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصول میں ہندوستان اور نجد کی تحریکیں ایک ہیں اوراسی یکسانی کی بنا پر اپنوں اور غیروں دونوں کو غلط فہمیاں ہوئیں، اور سید صاحب کی تحریک تجدید و جہاد کا ایجنڈا نجد کی دعوت توحید سے ملا دیا گیا۔ یہ تصنیف یہاں تک بڑھی کہ حج کے موقع پر سید صاحب کے نجدی داعیوں سے ملنے اور متاثر ہونے کا افسانہ زبان زد ہو گیا۔[1] حالانکہ یہ سب مغربی مورخوں کی اپج کے سوا اور کچھ نہیں۔ نجد و ہند کی تجدید تحریکیں اپنی اپنی جگہ بڑھیں اور پھلی پھولیں، ہندوستان کی دعوت توحید یعنی سید شہید اور مولانا شہید کی دعوت شیخ الاسلام کی دعوت سے بالکل متاثر نہیں۔(تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو:الحركة الوهابية الهندية السياية، ایضاً جلد ۸۔ وہابیت۔ایک دینی وسیاسی تحریک۔الہلال پٹنہ اپریل، مئی، جون ۱۹۳۷ء سیرت سید احمد شہید ۲۴۰-۲۴۳)

---

(۱) حضرت سید شہید کی دعوت تجدید و جہاد کو نجد کی دعوت توحید کا شاخسانہ بتانے میں تقریباً تمام مغربی اہل قلم ہم زبان ہیں اور بہت سے مشرقیوں نے ان کے سر میں سر ملانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس سلسلے میں جو دلچسپ حماقتیں جناب مارگولیتھ سے ہوئی ہیں۔ وہ شاید کسی کے حصے میں نہیں آئیں۔(ملاحظہ ہو: مقالہ وہابیت، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: ۴ ص ۱۰۹۰-۱۰۹۶) یہ پورا مضمون جہالت اور تنگ نظری کا مرقع ہے وقت اور موقع تو نہیں کہ اس مقالے کی دلچسپیاں بیان کی جائیں، مگر ایک لطیفہ نقل کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔
''سید احمد کے بھتیجے یا بھانجے (Nephew) (محمد اسماعیل کی ایک کتاب الصراط المستقیم ہندوستان کے وہابیوں کا قرآن بتائی جاتی ہے:
(A work by Muhammad Ismail, Nephew of Saiyid Ahmad, at Sirat-al Mustaqeem, is Said to be the Kuran of the Whabis of India)P-1090-
مولانا شہید سید صاحب کے بھتیجے صراط مستقیم وہابیوں کا قرآن کیا کہنے ہیں اس تحقیق اور ریسرچ کے کوئی نئی بات نہیں پیدا کی تو پھر ریسرچ کیا؟

لیکن اس اصولی اتحاد اور ظاہری مماثلت کے باوجود دونوں تحریکوں میں کچھ اختلاف بھی ہے اور یہ مقامی حالات اور مزاج کے تنوع کے لحاظ سے ہونا ناگزیر تھا، مولانا عبیداللہ سندھی نے انہی اختلافات پر بہت زور دیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں، اس گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا کا ارشاد پورا نقل کر دیا جائے۔

نجد و ہند کی تحریکوں میں فرق و اختلاف

''البتہ عرب کی نجدی تحریک سے حزب ولی اللہ بعض امور میں اشتراک رکھتا ہے، اس لیے ظاہر ہیں دونوں کو یکساں مان سکتے ہیں، عرب میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کے اتباع میں سے شیخ محمد عبدالوہاب[1] توحید کی دعوت دینے کے لیے اٹھتے

---

(۱) یہاں پر اصل کتاب کے حاشیے میں جناب شارح مولوی نورالحق صاحب علوی نے نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف: ۱۳۰۷ھ) کی کتاب ابجد العلوم سے شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب کا کچھ حال نقل کیا ہے، جس میں ہجو و مذمت کے سوا کچھ نہیں، نواب صاحب (اللہ انہیں معاف کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے) کا حال اس باب میں قابل رحم ہے، اہل نجد کے متعلق ان کے بیانات میں اتنا تعارض ہے کہ انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے، ابجد العلوم، التاج المکلل، موائد العوائد میں طرح طرح کی بے اصل باتیں لکھ دی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی الجھنوں کے باعث اپنے کو نجد، صادق پور، بلکہ ہر وہابی کہلانے والی جماعت سے الگ دکھانا چاہتے تھے، ترجمان وہابیہ ان کے خیالات پریشان کا آئینہ ہے، لیکن جناب شارح کی خدمت میں ہمیں ایک بات عرض کرنا تھی کہ جہاں آپ نے ابجد العلوم سے نواب صاحب کی رائے نقل کی تھی (جس میں اُن ابن عابدین شامی کی خرافات بھی ہیں، جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا مجرم عبدالوہاب نام رکھتا ہے، یا محمد بن عبدالوہاب) وہیں نواب صاحب کا یہ قول بھی نقل کر دیا ہوتا، جس میں انہوں نے شامی کا قول نقل کر کے اس کی تردید بھی کی ہے۔

واز یں جا ضعف تقریر ابن عابدین ظاہر شد دریں کہ دی غیر خود را مشرک می دانست و اسلام را منحصر در طریقہ خود می پنداشت و این نیز معلوم شد کہ عقیدہ او ہمہ موافق اہل سنت و جماعت امت ہر چہ نسبت او میگویند مختلق و موضوع است دوی بدان راضی نیست و این افتراء و کذب ہم در حیات وے بردے کردند و وے ازاں تبرا کرد و برآں انکار نمود الخ۔ (اتحاف النبلاء ص: ۴۱۶)

ہیں، حزب ولی اللہ میں بھی توحید کی دعوت اس طرح موجود ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں میں مسلم ہے۔

امام ولی اللہ نے شیخ ابرہیم کردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء میں بعض اساسی مسائل ایسے ہیں جو یقینا منہاج السنۃ سے لیے گئے ہیں۔ امام ولی اللہ، شیخ ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی یکساں عزت اور عظمت مانتے ہیں،...''

ایسا ہی مولانا محمد اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان (میں) جو حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے، شیخ محمد عبدالوہاب (محمد بن عبدالوہاب) کی کتاب التوحید کی طرح بعض مقامات پر ایک ہی سی بات لکھی ہے۔

ہندوستان میں جس قدر اہل علم حزب ولی اللہ کے مخالف ہیں وہ ان اشتراکی مواقع کی بنا پر دونوں تحریکوں کو ایک بنانے کے لیے کافی سے زیادہ کوشش کر چکے ہیں، ایسا ہی مولانا شہید کی تقویۃ الایمان کا التوسل فی الدعا کو جائز قرار دینا، اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دنیا دو اساسی مسئلے ہیں جو کتاب التوحید کے مناقض ہیں، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے اتباع ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، جو مولانا محمد اسماعیل شہید کے ان دونوں مسئلوں میں تابع ہوں، ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کا ایک سمجھنا سرسری سمجھ کا مغالطہ ہے۔(ص ۱۳۶-۱۲۹)

دونوں تحریکوں کا مقصد ایک ہی ہے

جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے، مولانا سندھی کا یہ فرمانا صحیح ہے، کہ نجد و ہند کی تحریکیں ایک نہیں، لیکن چند فروع اختلافات کی بنا پر ہم دونوں کو ایک دوسرے کا مناقض بھی نہیں سمجھتے، جب توحید کی دعوت دونوں تحریکوں میں موجود ہے، اور کتاب وسنت کی پیروی

پر دونوں کا اصرار ہے، تو پھر فروعی اختلافات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے؟ ہمارے نزدیک امام محمد بن اسماعیل الامیر صنعانی (۱۰۹۹-۱۱۸۲ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) تینوں بارہویں صدی ہجری میں اسوہ محمدی کے سچے نمونے تھے، اوراس وقت کی تیرہ وتاریک فضا میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتے تھے، آپ چاہیں تو انہیں مجدد بھی کہہ سکتے ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے ماحول میں دین کی تجدید کی، سنت محمدی سے صفاف اور شفاف چشمے کو شرک وبدعت کی آلائشوں سے پاک کیا، اور یہ انہی نفوس قدسیہ کے دم قدم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کتاب وسنت کا نام لینے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے اوراس پر عمل کرنا اپنا شعار بتاتے ہیں۔

انہی بزرگوں کی صف میں ان کے خوشہ چین قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ (۱۱۷۳-۱۲۵۰ھ) حضرت سید احمد بریلوی (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی (۱۱۹۳-۱۲۴۶ھ) بھی شمار کیے جاسکتے ہیں، ان تمام مصلحین امت کی جد وجہد کا مرکز ایک تھا۔ سب کے سب شمع رسالت کے پروانے تھے اور کتاب وسنت کے شیدائی، یہ اور بات ہے کہ کہیں امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کا رنگ غالب تھا، کہیں ہندوستانی تصوف کے اثرات باقی رہ گئے تھے، اور کہیں طریقہ محمدیہ کی تلقین ہورہی تھی۔ کسی پر شوق شہادت کا غلبہ تھا، کوئی تقلید جامد کے حق میں شمشیر براں کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور کسی کی معتدل مزاجی فقہ سے لے کر تصوف تک تطبیق کو پسند کرتی تھی، پر یہ رجحانات کا فرق ہے، اصولی اختلاف نہیں اور مزاج ومشرب کے اتنے معمولی فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا مناقض نہیں کہا جاسکتا اور ایک تحریک (یا دعوت) کے عقیدت مند کے لیے دوسرے کے ساتھ وابستگی حرام نہیں قرار دی جاسکتی، ایک ولی اللہی شوکانی رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اور نجدی ولی اللہیوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرسکتا ہے۔ اور یمنی لیلائے علم کی

تلاش میں بادیہ نجد کی ٹھوکریں کھانا گوارا[1] کرسکتا ہے۔اور علم وعمل کے اس ''لین دین'' میں فائدے کے سوا نقصان کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک ہندی نژاد کے لیے یمنی یا نجدی اہل علم کی شاگردی اس قدر ملعون و مذموم کیوں قرار دی جاری ہے؟ کیا اسلام اسی تنگ نظری اور جغرافی حد بندی کی تعلیم دیتا ہے؟

رہ گئے چند اختلافی مسئلے تو سمجھ دار لوگوں کے لیے ترجیح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔آخر کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان آسمانی کتابیں تو ہیں نہیں جن سے ادنیٰ اختلاف بھی معصیت شمار ہو، اور پھر یہ مختلف فیہ مسئلے ہیں کتنے! مولانا عبیداللہ سندھی جیسے نکتہ رس عالم نے بڑی کوشش سے ایسے دواساسی مسئلے نکالے ہیں، جن میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ا۔توسل فی الدعا میں اختلاف

ان میں سے پہلا مسئلہ التوسل فی الدعا کا ہے:

''التوسل فی الدعا مثلاً اللہ تعالیٰ سے استدعا کی جائے بحرمت فلاں یا بحق فلاں کہہ کر تو اس توسل کو ابن عبدلوہاب نہایت شدت سے ممنوع قرار دیتا ہے، مولانا محمد اسماعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے، تقویۃ

---

[1] (ا) یہ کوئی خیالی باتیں نہیں، پچھلے تذکروں میں اس ''لین دین'' کی بے شمار مثالیں ملیں گی، دوتین نظیریں سرسری طور پر عرض ہیں، عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ (ف:۱۲۸۹ھ) نے شوکانی (ف:۱۲۵۰ھ) اور دوسرے علمانے حجاز دین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، محمد بن ناصر حجازی نجدی (ف:۱۲۸۳ھ) نے شوکانی سے یمن میں اور شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (ف:۱۲۶۲ھ) سے حجاز میں تحصیل کی، اسی طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف:۱۲۰۶ھ) کے پرپوتے اسحاق بن عبدالرحمن بن حسن بن محمد نجدی حنبلی (ف:۱۳۱۹ھ) نے سید نذیر حسین صاحب محدث سورج گڈھی (دہلوی، ف:۱۳۲۰ھ) اور مولانا محمد بشیر سہسوانی (ف:۱۳۴۶ھ) سے ہندوستان آکر استفادہ کیا...۔

الایمان میں اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں۔'' (ص۱۳۶ حاشیہ)

تقویۃ الایمان کی تصریح بھی پیش خدمت ہے:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگوں میں ایک ختم مشہور ہے، کہ اس میں یوں پڑھتے ہیں، یا شیخ عبد القادر جیلانی شیاللہ، یعنی اے شیخ عبد القادر جیلانی کچھ دو تم اللہ کے واسطے، یہ لفظ نہ کہا جائے ہاں اگر یوں کہے کہ یا اللہ کچھ دے شیخ عبد القادر کے واسطے تو بجا ہے...۔ (ص۵۶ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۸)

مسئلے کی تنقیح

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ قابل لحاظ ہے، کہ توسل فی الدعا کوئی ایسا اساسی مسئلہ نہیں جس میں مولانا شہید اور شیخ ابن عبد الوہاب کے اختلاف کو اتنی اہمیت دی جائے دوسری بات یہ کہ مولانا سندھی کا بیان بہت مجمل ہے، اختلاف کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، توسل فی الدعا کی یہ نوعیت جسے ہم توسل بالذوات بھی کہہ سکتے ہیں۔ احیا میں بلا اختلاف [1] جائز ہے، اموات سے توسل کے یہ معنی ہیں، کہ ان کے اعمال خیر و مقبولہ سے توسل کیا جائے، تو جس طرح اپنے اعمال خیر سے توسل جائز ہے، اسی طرح دوسرے احیا و اموات کے اعمال خیر سے بھی، البتہ اموات سے خطاب کر کے اگر مستقلا ان سے مانگا جائے، تو یہ شرک ہے، اور اس کے عدم جواز پر بھی اتفاق ہے، اور اگر

---

(۱) واما التوسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم والتوجہ بہ فی کلام الصحابۃ والتابعین فیریدون بہ التوسل بدعائہ و شفاعتہ... والثانی التوسل بدعائہ و شفاعتہ و ھذا کان فی حیاتہ و یکون یوم القیامۃ یتوسلون بشفاعتہ. (التوسل والوسیلہ لابن تیمیۃ: ۴۴)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک توسل بالذات کے معنیٰ توسل بالدعا ہی کے ہیں جو احیاء میں جائز ہے۔

ذوات صالحہ (اموات) سے یہ سمجھ کر توسل کیا جائے کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمالے، تو یہ صدیوں سے محققین علماء کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے۔ (اور توسل فی الدعا کی یہی وہ صورت ہے جس میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی رائیں مختلف ہیں) شیخ عزالدین ابن عبدالسلام (ف ۶۶۰ھ توسل بالذوات کی صورت میں) کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔

لایجوز التوسل الی اللہ تعالیٰ الا بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان صح الحدیث فیہ. (الدر النضید ص۶)

''اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں، بشرطیکہ وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے صحیح مان لی جائے۔''

اس کے برخلاف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ف:۷۲۸ھ) اسے بالکل ممنوع قرار دیتے ہیں اور یہی مسلک فقہائے حنفیہ[۱] کا معلوم ہوتا ہے، شیخ محمد بن عبدالوہاب بھی امام تیمیہ رحمہ اللہ کے مسلک پر سختی کے ساتھ عامل ہیں، امام شوکانی (ف:۱۲۵۰ھ) تمام انبیاء اور صالحین سے توسل کو جائز کہتے ہیں (الدر النضید ص:۶۰۸) تقویۃ الایمان کی عبارت سے مولانا شہید کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

جب محققین علمائے سنت توسل بالذوات کے مسئلے میں اتنی مختلف رائیں رکھتے ہیں[۲]

---

(۱) ویکرہ ان یقول فی دعائہ بحق فلان او بحق انبیائك و رسلك لانہ لا حق للمخلوق علی الخالق (الھدایۃ: کتاب الکراھیۃ ص:۱۰۸۷، مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۸ء نیز ملاحظہ ہو: جلاء العینین ص:۲۸۱۔

''اور یہ مکروہ ہے کہ کوئی بحق فلاں کہہ کر دعا مانگے۔ یا اللہ تعالیٰ سے اس کے پیغمبروں اور رسولوں کی حرمت اور حق کا واسطہ دلا کر استدعا کرے اس لئے کہ خالق پر مخلوق کا کوئی حق نہیں ہوسکتا۔''

(۲) توسل پر تفصیلی معلومات کے لیے سب سے بہتر کتاب امام ابن تیمیہ کی ''قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ'' ہے۔ (جلاء العینین ص ۳۱۵،۲۶۹، میں بھی مفصل بحث ہے، اور فریقین کے دلائل جمع کرائے گئے ہیں۔

تو پھر کسی ایک رائے پر اتنا تشدد کیوں برتا جائے؟ اور اگر مولانا شہید کے کسی عقیدت مند کو فقہائے حنفیہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے بھلی لگتی ہو، تو صرف اتنی سی بات پر، اسے مولانا شہید رحمہ اللہ کے حلقۂ ارادت سے کیوں خارج کیا جائے؟

۲۔ مسئلہ شرک اصغر اور شرک اکبر میں اختلاف

دوسرا مسئلہ حسب ذیل ہے، آیت (إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ) کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے، اس آیت کا ظاہری اقتضا یہی ہے، کہ شرک غیر مغفور ہے اور ماورائے شرک دوسرے کبائر قابل مغفرت ہیں۔ یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے، اب شرک کے لفظ کا دو درجوں پر اطلاق ہوتا ہے، شرک اکبر، شرک اصغر، شرک اکبر تو یقینا کفر ہے... شرک اصغر کو اہل علم کبائر میں شمار کرتے ہیں۔ ابن عبد الوہاب اس کو شرک اکبر سے ملاتا ہے۔ چونکہ نص میں عموم ہے، اس لیے وہ تخصیص کی اجازت نہیں دیتا، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرک اصغر میں مبتلا ہے، اس کا اسلام ان کے یہاں مقبول نہیں ہے۔

مولانا شہید یہاں حکم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں، شرک اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے۔ وہ مغفور نہیں ہوگی، شرک اصغر کبائر میں شامل نہیں۔ اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی، مگر وہ کفر کے برابر نہیں... (ص: ۱۳۶، ۱۳۷ حاشیہ)

مسئلے کی صحیح نوعیت

ہمیں افسوس ہے کہ یہاں مولانا سندھی نے ابن عبد الوہاب اور مولانا شہید دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کی، تقویۃ الایمان کا وہ ٹکڑا جس پر یہ عمارت کھڑی

کی گئی ہے، حسب ذیل ہے۔

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک نہ بخشا جاوے گا، جواس کی سزا ہے مقرر ملے گی، پھراگر پرلے درجے کا شرک ہے، کہ آدمی جس سے کافر ہوجاتا ہے، تواس کی سزایہی ہے، کہ ہمیشہ ہمیشہ کودوزخ میں رہے گا... اور جواس سے ورے درجے کا شرک ہے، ان کی سزا جواللہ کے یہاں مقرر ہے سو پاوے گا، اور باقی جوگناہ ہیں ان کی جو کچھ سزائیں اللہ کے یہاں مقرر ہیں۔ سواللہ کی مرضی پرہیں چاہے دیوے چاہے معاف کرے۔'' (تقویۃ الایمان ص: ۱۳)

جہاں تک شرک کے غیر مغفور ہونے کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ، البتہ مندرجۂ بالا عبارت سے شرک اصغر پر اصرار کرنے والوں کے مسئلے میں اختلاف رائے کا شبہ ہوتا ہے لیکن تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے مطالعے اور مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک اصغر میں بھی دونوں کی رائیں ملتی جلتی ہیں۔ اہل نجد نے بھی ان مسلمانوں کی، جوشرک اصغر میں مبتلا ہیں۔ علی الاطلاق تکفیر نہیں کی۔ [1] البتہ تارکین صلوٰۃ [2]

---

(۱) و من جملة هٰذه الاكاذيب ما ذكره... ان شيخ الاسلام محمد بن عبدالوهاب يسفك الدماء... و يتجارى على قتل النفوس... و تكفير الامة والمحمدية فى جميع الاقطار و هذا كله كذب۔ (تبرئة الامامين: ص: ۸۵)

''اوران کذب بیانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (خلق اللہ کا) خون بہاتے ہیں اورانسانوں کی جان لینے میں حد سے زیادہ جری ہیں اور دنیا جہان کے مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں... یہ سب جھوٹ ہے۔''

(۲) تارکین صلوۃ کے بارے میں اہل نجد کے مسلک سے واقفیت کے لئے ملاحظہ ہو: (الهدية السنية ص: ۸۶-۶۹) ان کا بڑا استدلال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مستحکم روش سے ہے جوانھوں نے مانعین زکوۃ کے مقابلے میں اختیار کی تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تبرئة الشيخين الامامين من تزوير اهل الكذب و المين مرتبہ سلیمان بن سحمان نجدی)

اور مانعین زکوٰۃ کی طرح یہ ان لوگوں سے بھی قتال کے قائل ہیں، جو قبر پرستی اور تعزیہ پرستی وغیرہ (جسے شرک اصغر کہا جاتا ہے) میں مبتلا ہیں اور وہ بھی تبلیغ وفہمائش کے بعد بالکل اسی طرح مولانا شہید رحمہ اللہ بھی قبر پرستوں کو (یعنی ان مسلمانوں کو جو شرک اصغر میں مبتلا ہیں) مشرکین عرب سے کم نہیں سمجھتے۔

''یعنی شرک دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کسی کے نام کی صورت (مورت) بنا کر پوجے، اس کو عربی زبان میں صنم کہتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ کسی تھان کو مانے یعنی کسی کے مکان یا درخت کو... کسی کے نام کا ٹھہرا کر پوجے۔ اس کو عربی زبان میں وثن کہتے ہیں، اس میں داخل ہے، قبر اور کسی کا چلّہ اور لحد اور کسی کے نام کی چھٹی اور تعزیہ اور علم... کہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور وہاں جا کر نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں... اور اسی طرح بعض مکان مرضوں کے نام سے مشہور کرتے ہیں... غرض کہ یہ سب وثن ہیں، سو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ مسلماں جو قیامت کے نزدیک مشرک ہوجاویں گے، ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا کہ ایسی چیزوں کو مانیں گے، برخلاف اور مشرکوں کے کہ جیسے ہندو یا مشرکین عرب کہ اکثر صنم پرست ہیں، یعنی مورتوں کو مانتے ہیں۔ سو دونوں مشرک ہیں۔ اللہ سے پھرے ہوئے رسول کے دشمن۔'' (ص: ۴۴۔ ۴۳، تقویۃ الایمان)

یہ مفہوم ایک دوسری جگہ اور صاف طور سے ادا ہوا ہے۔

''اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور بندہ سمجھتے تھے۔ اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی، اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی ان کا

کفر وشرک تھا، سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو کہ اس کو اللہ کا بندہ ومخلوق ہی سمجھے۔ سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے۔" (ص: ۷-۸)

ہمیں بتایا جائے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ ان کے شاگردوں اور ماننے والوں نے اس سے زیادہ کیا کہا ہے؟ اور کہاں کہا ہے؟ اسی لیے ہم نے اوپر یہ کہنے کی جرأت کی کہ مولانا سندھی نے اس مسئلے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ یا مولانا شہید رحمہ اللہ دونوں میں سے کسی کی ٹھیک ترجمانی نہیں کی۔ مولانا شہید رحمہ اللہ کی کتاب تو سب کے سامنے ہے، اس لیے ان کے مسلک کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ باقی رہا اہل نجد کا مسلک، سو اسے راقم سیرت ابن عبدالوہاب میں اچھی طرح واضح کر چکا ہے۔ اہل نظر، خود اہل نجد کی تالیفات [1] پڑھ کر کھرے کھوٹے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

یہ تھے "دو اساسی مسئلے" جن میں مولانا سندھی کے خیال کے مطابق تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے فتوے ایک دوسرے کے "مناقض" ہیں۔ اور نجد وحزب ولی اللہ کے یہی وہ معرکۃ الآراء اختلافی مسئلے ہیں۔ جن کی بناء پر مولانا سندھی کا ولی اللہی "نجد کے وہابی" سے تعاون نہیں کر سکتا۔

اب رہ گیا یمن اور حزب ولی اللہ کا اختلاف، سو اس کے متعلق کچھ تو امام شوکانی (ف: ۱۲۵۰ھ) کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن ایک دو باتیں رہ گئی تھیں، جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں، ہمارے مولانا نجد ویمن کا ذکر اس طرح ایک ساتھ کرتے آئے ہیں کہ گویا ان کے خیال میں ہندوستان اور "ولی اللّٰہیت" کے خلاف نجد ویمن کا ہمیشہ "متحدہ محاذ" رہا ہے۔ اور شاید اسی لیے وہ نجدی اور یمنی دونوں تحریکوں سے یکساں برہم ہیں لیکن اسے ہم کیا کریں کہ واقعہ یہ نہیں، حسب ذیل

---

(۱) اجمالی رائے قائم کرنے کے لئے سلیمان بن حمدان نجدی کے مرتب کردہ مجموعے (الهداية السنية والتحفة الوهابية الجديدة، کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اس میں پانچ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

گذارشات سے نجد و یمن کی دائمی یک رنگی کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

نجد و یمن کے ”متحدہ محاذ“ کی حقیقت

(الف) یمن کے نامور عالم محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ (ف: ۱۲۵۰ھ) اُصول وفروع میں مجتہد تھے اس لیے کسی ایک فقہی مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی اور تقلید کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، ان کے برخلاف ابن عبدالوہاب رحمہ اللہ (ف: ۱۲۰۶ھ) حنبلی ہیں، اور حنابلہ میں بھی ان کا اعتماد زیادہ تر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم رحمہ اللہ (ف: ۷۵۰ھ) کی تحقیقات واجتہادات پر ہے۔

(ب) ابھی ابھی نجد و ہند کے دو اختلافی مسئلوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے پہلے مسئلے (توسل فی الدعاء) میں امام شوکانی رحمہ اللہ۔ مولانا شہید کے ہم نوا ہیں۔ وہ انبیاء اور تمام صالحین کی ذات سے توسل جائز رکھتے ہیں۔ (الدر النضید فی اخلاص کلمة التوحید: ص۸۷۰۷۶)

(ج) دوسرے مسئلے (شرک اکبر واصغر) میں وہ اہل نجد کے ہم خیال ہیں (اگر مولانا سندھی کی رعایت سے اس مسئلے میں تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کے درمیان ادنیٰ اختلاف بھی مان لیا جائے) قبر پرستی (عبادۃ القبور) اور بُت پرستی (عبادۃ الاصنام) کے درمیان فرق کرنے والوں پر انہوں نے سخت حملے کیے ہیں۔ (الدر النضید، ص: ۱۲۔۳۵۔۴۰)

(د) زمان ومکان کی قربت کے باوجود امام شوکانی رحمہ اللہ (۱۱۷۳ھ، ۱۲۵۰ھ) کو شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب رحمہ اللہ (۱۱۱۵ھ، ۱۲۰۶ھ) کی دعوت کی صحیح نوعیت بھی نہیں معلوم ہوسکی تھی۔ البدر الطالع (ج: ۲، ص: ۵) میں اُنہوں نے امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹ھ، ۱۲۱۸ھ) کے کچھ حالات لکھے ہیں، تعریف کے ساتھ ساتھ یہ فقرہ بھی

درج ہے:

ولکنهم یرون ان من لم یکن داخلاً تحت دولة صاحب نجد و ممتثلا لاوامره خارج عن الاسلام...(۵:۲)

''لیکن ان کا خیال ہے کہ جو فرمانروائے نجد کی حکومت میں داخل اور اس کے احکام کا تابعدار نہیں۔ وہ اسلام سے خارج ہے۔''

پھر انہیں خود اس بیان کی صداقت پر شبہ ہوتا ہے اور یہ فقرہ اضافہ کرتے ہیں۔

...و تبلغ عنهم اشیاء الله اعلم لصحتها.

''اور ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔''

ان تصریحات کی موجودگی میں نجد و یمن کی وحدت پر زور دینا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے؟ اس تفصیل سے راقم یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس طرح شاہ ولی اللہ اور ابن عبدالوہابؒ یا شوکانی رحمھم اللہ کے درمیان بعضے مسئلوں میں اختلاف ہے۔ اسی طرح شوکانی اور ابن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہما بھی ہر مسئلے میں متفق الرائے نہیں۔ اس لیے نجد و یمن کو ایک کہنا اور دونوں کو ولی اللّٰہیت کا ''مناقض'' بتانا صحیح نہیں، دنیا کی کوئی دو تحریکیں ہر ہر مسئلے میں متحد الرائے نہیں ہوسکتیں اور اہل علم کو جزئی و فروعی مسئلوں میں سخت گیر نہیں ہونا چاہیے ورنہ تحقیق کی راہ مسدود ہو جائے گی۔

مسئلہ وحدت الوجود مسلک ولی اللّٰہی کی بنیاد نہیں ہے

یہ صحبت بھی ختم ہونے کو آئی، پر اس تقابل اور موازنے کے سلسلے کی ایک اہم بات رہ گئی۔ مختصر طور پر عرض کیے دیتا ہوں۔ ان دو اساسی مسئلوں کے علاوہ جن پر ابھی گفتگو ہو رہی تھی ولی اللّٰہیت اور بیرون ہند کی توحیدی تحریکوں کے درمیان ایک بنیادی فرق اور رہ جاتا ہے جس پر مولانا سندھی کو بے حد اصرار ہے۔

’’امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدت الوجود کے مسئلے پر مرتکز ہے وہ امام ربانی کی وحدت شہود کو بھی وحدت وجود سے تطبیق دیتے ہیں۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وحدۃ الوجود کے ماننے والوں سے جس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں، وہ دنیا کو معلوم ہے جب کہ دونوں تحریکوں کی ذاتیات میں اس قدر اختلاف ہو تو ان کو محض بعض اُمور کے اشتراک سے ایک نہیں کہا جا سکتا ہے۔(ص ۱۳۴)

مولانا صحیح فرماتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ف: ۷۲۸ھ) واقعی وحدت الوجودیوں سے شدید نفرت رکھتے ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ (ف: ۱۱۷۶ھ) کسی نہ کسی درجے میں وحدت الوجود کو مانتے ہیں، بلکہ وہ ابن عربی (ف: ۶۳۸ھ) کی وحدۃ الوجود اور امام ربانی (ف: ۱۰۳۴ھ) کی وحدت شہود کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ ’’امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر مرتکز ہے۔‘‘ تھوڑی سی توضیح چاہتا ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ ان کی دعوت اور تعلیمات کی بنیاد اور محور یہی فلسفہ ہے۔ تو ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے۔ اور اگر یہ مفہوم ہے کہ شاہ صاحب اپنے علم و فضل اور درجۂ امامت کے باوجود اس خاندانی میراث (عقیدۂ وحدۃ الوجود) سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے) تو صحیح ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح فقہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا رجحان محاکمہ اور تطبیق کی طرف ہے۔ اسی طرح وحدۃ الوجود کے عقیدے میں بھی ان کی طبعی وسعت قلب اور خاندانی اثرات کے ساتھ تطبیق کا ذوق بھی کام کر رہا ہے۔ اس لیے ہم عقیدۂ وحدۃ الوجود کو شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتیات میں تو شمار کر سکتے ہیں، مگر اسے مسلک ولی اللہی کی خصوصیت ماننے کے لیے تیار نہیں۔

سیدین شہیدین بھی وجودیت کے قائل نہیں تھے

اور تو اور خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نامور پوتے مولانا شہید رحمہ اللہ وجودیت کے قائل نہ رہ سکے۔ عبقات تک تو وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر معلوم ہوتے ہیں، لیکن بعد میں تکیہ رائے بریلی کے سید زادے رحمہ اللہ کے فیض صحبت سے فلسفہ وتصوف کا یہ غیر مطبوع رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سید صاحب سے ان کی گہری وابستگی اور عقیدت (جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے) کا تقاضا بھی یہی تھا، سید صاحب رحمہ اللہ کے متعلق مولانا سندھی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل ہو چکا ہے کہ ان کے خاندان میں ''حضرت مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہوگئی تھیں'' اور یہ کہ ان کا خاندان ''اپنا خصوصی مشرب اور فکر رکھتا ہے۔'' (ص ۱۴۵) اس لیے حضرت سید شہید رحمہ اللہ تو امام ربانی مجدد الف ثانی (ف: ۱۰۳۴ھ) کے مسلک [1] پر تھے ہی، مولانا شہید رحمہ اللہ بھی ان سے متاثر ہوئے۔ جس پر صراط مستقیم کے اوراق گواہ ہیں۔ (ص: ۵، ۱۲، ۱۳، ۴۶، ۴۵، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۰، الخ الخ) افسوس کہ جگہ کی تنگی زیادہ پھیلاو سے روکتی ہے۔ اس لیے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے جو شہیدین کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

> ''... واز جملہ بدعات ملاحدۂ وجودیہ کہ در خواص وعوام اشتہار یافتہ و بااقوال اکابر طریقت مشتہر گریدہ۔ گفتگو ہائے توحید وجودی الحادی است کہ بگمان اتحاد خود با خدا ازاں لذتہائے نفسانی برمیدارند وتبسویل شیطانی ومکر نفوس خبیثہ بیان آں گفتگو را معارف وحقائق می پندارند ولا اقل ازمضرات آں

---

(۱) حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا تصور توحید اور ان کا طریق فکر معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو: برہان احمد صاحب فاروقی کی کتاب The Mujaddid's conception of Tauhid اس میں حضرت شاہ صاحب، سید صاحب، مولانا شہید رحمہم اللہ اور دوسرے بزرگوں کے مسلک پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

اوقات عزیزۂ خودرا بلاطائل محض صرف می نمایند پیشوائے ما محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بآں امر نہ فرمودہ و ہرگز لب بہ بیاں آں نکشودہ پس مارا ازاں چہ سود...'' (صراطِ مستقیم: ۵۰۴، مطبع مجتبائی، دہلی)

''توحید وجودی الحادی'' اور ''بدعات ملاحدہ وجودیہ'' کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اورشہیدین رحمھما اللہ (اللہ ان کی تربت پرانوار رحمت کی بارش کرے) کے درمیان بہت کم فرق رہ جاتا ہے، اور خاکسار یہی دکھانا چاہتا تھا۔ باقی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق ہم یہ عرض کر چکے کہ یہ عقیدہ ان کی ذاتیات میں ضرور داخل ہے لیکن مسلک ولی اللہی کی خصوصیت نہیں بن سکتا۔ ورنہ حضرت سید صاحب رحمہ اللہ اور مولانا شہید کو مسلک ولی اللہی سے خارج کرنا پڑے گا اور شاہ ولی اللہ کے ارہاص[1] امام ربانی کے ارشادات بھی اس مسلک ولی اللہی کے مناقض قرار پائیں گے، اور اگر مولانا سندھی کو اس پر اصرار ہے کہ حکمت ولی اللہی کی اساس یہی وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہے، تو پھر ہمیں امام دارالہجرۃ سیدنا مالک بن انس رحمہ اللہ (ف:۱۷۹ھ) کا مشہور قول:

كل واحد يوخذ منه و يرد عليه الا صاحب هذا القبر صلى الله عليه وسلم.

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا ہر شخص کے اقوال میں ردوقبول کی گنجائش ہے۔''

پڑھ کر بصد ادب اس ''حکمت ولی اللہی'' سے براءت کرنا پڑے گی۔ اس لیے کہ ہمارا مرجع کتاب وسنت کے مقابلے میں کسی انسان کا خودساختہ فلسفہ نہیں ہوسکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا مفکر اور عالم کیوں نہ ہوں۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ کی تحریک کے لئے اگر کوئی بزرگ سلف صالح کا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ فقط امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے وجود میں منحصر ہے، ان کو امام ولی اللہ اپنے طریقہ کا ارہاص مانتے ہیں۔ (ص ۱۴۱)

سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ پر وجودیت کا الزام

اس وحدت والوجود کے سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سید نذیر حسین صاحب محدث رحمہ اللہ (میاں صاحب دہلوی) سورج گڈھی مونگیری (م: ۱۲۲۰ھ، ۱۸۰۵ء، ۱۳۲۰ھ، ۱۹۲۰ء) کے متعلق مولانا سندھی کہتے ہیں کہ وہ بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔

''مولانا نذیر حسین مولانا ولایت علی کے مدرسہ (صادق پور) پٹنہ کے ابتدائی طالب علم ہیں۔ بہار سے جب دہلی پہنچے تو الصدر الحمید اور ان کے اصحاب کی صحبت میں ہی علمی تکمیل سے فارغ ہوئے۔ غزوۂ دہلی تک مولانا محمد اسحاق کے مسلک کے پابند رہے۔ اس کے بعد اگرچہ بہ ضرورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف میلان ظاہر کرتے رہے مگر فتاویٰ عالمگیریہ کا مشغلہ اور ہدایہ کی تدریس اور وحدۃ الوجود کا فلسفہ ان کی پرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا۔'' (ص: ۱۹۶)

جہاں تک وحدت الوجود کے عقیدہ کا تعلق ہے، یہ پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ میاں صاحب رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں تھے۔ شیخ اکبر (ابن عربی) کی تعظیم وہ ضرور کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن عربی (ف: ۶۳۸ھ) بھی تقلید شخصی کے سخت مخالف تھے (الحیات بعد الممات ص: ۲۱۰) اور ان کی یہ ادا میاں صاحب رحمہ اللہ کو بہت پسند آئی تھی، اور اسی لیے وہ شیخ اکبر کی تکفیر کے مخالف تھے، مولانا سندھی نے ''الحیات بعد الممات'' کے حوالے سے قاضی بشیر الدین قنوجی رحمہ اللہ اور میاں صاحب کے جس مناظرے کا ذکر کیا ہے وہ ابن عربی کی تکفیر ہی کے مسئلے پر تھا، وحدۃ الوجود سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (الحیات بعد الممات ص: ۱۲۳)

باقی ہدایہ کی تدریس، فتاوی عالمگیری کا مشغلہ اورشاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ کے مسلک کی پابندی،تو یہ چیزیں ہمارے نزدیک ضمنی حیثیت رکھتی ہیں، یوں کون نہیں جانتا کہ ولی اللہیوں میں میاں صاحب کومولانا شہید سے زیادہ عقیدت تھی، جس کا ذکر وہ بار بار کیا کرتے تھے۔ (الحیات بعدالممات ص: ۱٦۷۔ میاں صاحب کے مسلک کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:الحیات بعدالممات ص: ۵۴، ۵٦، ۱۲۳، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۰۷)

خاکسار کومولانا عبیداللہ سندھی کی زیرنظر کتاب (شاہ ولی اللہ اوران کی سیاسی تحریک) سے متعلق جو کچھ عرض کرنا تھا، عرض کر چکا۔ یہ فیصلہ کرنا تو اس وقت عاجز کے لیے بہت مشکل ہے کہ اس سے کہاں کہاں لغزشیں ہوئی ہیں۔ البتہ اپنی کوشش یہی رہی ہے کہ واقعات اور مسئلوں کی زیادہ سے زیادہ چھان پھٹک کر لی جائے، پھر بھی اہل نظر سے درخواست ہے کہ وہ کوتاہیوں اور لغزشوں کی نشان دہی میں بخل نہ کریں۔ تحقیقی طور پر جو رہنمائی کی جائے گی وہ شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

یہ گزارش خاص طور پر اس لیے بھی کی جارہی ہے کہ راقم چندسالوں سے سید شہید رحمہ اللہ اوران کی دعوت تجدید و جہاد پر کچھ چھان بین کررہا ہے۔ اوراللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھا خاصہ مواد بھی فراہم ہو چکا ہے لیکن بعض گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں ترتیب وتبویب اب تک شروع نہیں ہوسکی ہے، اس لیے اس درمیانی منزل میں بزرگوں کی ہدایتیں اور دوستوں کے مشورے بہت کارآمد ہوسکتے ہیں۔

سندھی فلسفے کی معجون مرکب کے کچھ اورزہریلے اجزاء

خیر راقم کو جو کچھ عرض کرنا تھا وہ تو عرض کر ہی چکا، لیکن اس کے بعد بھی سیاسیات و مذہب و فلسفہ کے اس معجون مرکب میں مسموم اجزاء کی کمی نہیں، اولاً تو فلسفہ و سیاست و مذہب کے اس معجون کا اصل نسخہ ہی غلط ہے مگر خاکسار اس کی تحلیل پر قادر نہیں کہ اس کے

لیے طب ولی اللہی میں صداقت ضروری ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ حقیر شاہ صاحب کی تصنیفات پر بہت سرسری نظر رکھتا ہے لیکن اصل نسخے Thesis کے علاوہ بھی اس معجون میں کچھ زہریلے اجزاء موجود ہیں، جن کی تحلیل کی ضرورت نہیں، وہ اتنے ''زہریلے'' ہیں کہ ان کا نگاہوں کے سامنے لے آنا کافی ہے۔

''جو قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کر کے اور یوروپین طریقے پر سپاہی بننا نہیں سیکھیں گی وہ ہندوستان کی آئندہ حکومت نہیں سنبھال سکتیں ہیں، باوجود ہزار ہا اختلافات کے سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب کی ہمیشہ تائید کرتا ہوں کہ وہ میری قوم کو فوج میں بھیجنے کا حامی ہے، سو میں نوے فی صدی افراد جنگ میں مر سکتے ہیں مگر دس جو واپس آئیں گے وہ ہمارا اصل سرمایہ ہوگا:

اور سنئے:

''ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں، اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانا چاہیئے، اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ یورپین ازم بنالیا ہے۔ ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں، ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں۔'' (ص ۸۰)

خیر اس وقت کے بڑے بڑے عالم ناواقف ہوں، تو کوئی حرج نہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ بھی ان حقائق سے ناواقف تھے۔ پتہ نہیں حجۃ اللہ البالغہ کے کس باب میں ''مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے'' کی تلقین کی گئی ہے، کیا مسلم قوم بھی ہندو قوم کی طرح کوئی پیدائشی قوم (Nation) ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور وعظ ارشاد ہوتا ہے:

''یورپ کے طریقے پر کاشت کاروں کو عالم بنایا جاسکتا ہے، سب سے پہلے انہیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہئے، اس کے لیے ہمارا عربی رسم الخط ایک مانع قوی ہے کہ ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے، اس کو یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیے بے حد دشوار ہے۔ رومن حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حرف شناسی کے بعد ساری عمر کے لیے انسان فارغ ہو جاتا ہے۔'' (ص ۸۱)

آخر میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے حزب کو مخالف عناصر سے قطعی پاک کرنے کی جو تجویز ص: ۲۰۳ کے متن اور خصوصاً حاشیہ میں پیش کی گئی اور یورپ کی پارٹیوں کے طریق کار سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ کیا اسلام کی تعلیم ہے؟

میرے نزدیک کتاب کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے لے کر حضرت حاجی امداد اللہ بلکہ مولانا محمود حسن صاحب تک یہ تمام اکابر اُمت درحقیقت صرف سیاسی لیڈر اور سیاسی مفکر تھے۔ اور ان کی بزم میں دین وملت اور ایمان و ایقان صرف فانوس (گلوب) تھا۔ شمع نہ تھی، صاف یوں کہئے کہ سیاست اور فکر انقلاب کی حقیقت پر دینداری اور حکمت ایمانی فقط بطور غلاف تھا، کیا ان بزرگوں کی بزرگی یہی حقیقی تصویر ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**''

اب یہ عاجز طول کلام کی معافی چاہتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔

کتاب دوم

”مولانا عبید اللہ سندھی“

پر

ایک ناقدانہ جائزہ

’’مولانا عبیداللہ[1] سندھی‘‘

پر

ایک ناقدانہ جائزہ

مولانا عبیداللہ سندھی کی شخصیت ایک عجیب وغریب شخصیت ہے۔ اوران کے افکار ان کی شخصیت سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہیں۔ ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، اسلام قبول کیا۔ دیوبند میں تعلیم پائی۔ سیاسیات میں داخل ہوئے، اوراس طرح کی ہندوستان چھوڑنا پڑا، جلاوطنی کی زندگی کابل، ماسکو، انقرہ اور یورپ کے مختلف مقامات میں گزری آخر میں حجاز آ گئے تھے۔ دس بارہ برس حرم کے سائے میں بھی رہے اوراب پانچ سال ہوتے ہیں کہ وطن کی کشش پھرانہیں ہندوستان کھینچ لائی ہے۔

مولانا کی زندگی کوئی پُرسکون زندگی نہیں رہی ہے۔ دنیا کے تمام نشیب وفراز، دُکھ سکھ اوررنج ومحن کی گھاٹیوں سے وہ کامیاب گزر چکے ہیں، اوراب کہ سفینۂ عمر ساحل کے قریب

---

(۱) مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے حالات اوران کے افکار پر یہ کتاب، ان کے افکار سے متاثر پروفیسر محمد سرور (متوفی ۱۹۸۳ء) استاد جامعہ ملیہ دہلی نے لکھی تھی جو سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اسی کتاب کا ایک اجمالی جائزہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اس کتاب میں لیا ہے، جواب قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔ (ص۔ی)

آگاہے، وہ اپنے تجربات زندگی اور نصف صدی کے مطالعے کے نتائج سے ہمیں مستفید کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان آنے کے بعد پہلے پہل انہوں نے کلکتہ میں ایک تقریر کی، جس سے ہمارے حسن ظن کو جھٹکا لگا، اس میں اُنہوں نے انگریزی لباس زیب تن کرنے لاطینی حروف اختیار کرنے کی تلقین کی تھی، ظاہر ہے کہ صرف ''صاحبوں'' کا لباس اختیار کر لینے سے انسان ''صاحب'' نہیں ہوجاتا۔ اور نہ لاطینی حروف برت لینے سے سائنس وفلسفہ کے اسرار کھل جاتے ہیں، یہ ایک سطحی اور مرعوب ذہنیت کی دعوت تھی۔ اور مولانا سندھی کی زبان سے ایسی باتیں سن کر طبعی طور پر بڑا دکھ ہوا۔

اس کے بعد الفرقان ولی اللہ نمبر (۵۹ھ، ۴۰ء) میں انہوں نے امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف کرایا، گو اس میں بھی بہت سی باتیں قابل گرفت تھیں، مگر دوستوں نے یقین دلایا کہ ''مولانا اپنے افکار کے اظہار'' پر قادر نہیں، اور ان کا حال کچھ فرقہ ملامتیہ کا سا ہے، شروع شروع میں وحشت ہوتی ہے۔ ''پھر انسان مانوس ہوجاتا ہے'' — ہم نے جی کڑا کر کے اس ''اجمالی تعارف'' کا بار بار مطالعہ کیا، مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری طبیعت اس سے مانوس نہ ہوسکی۔ ''نیشنلزم'' کی تبلیغ خواہ کتنے ہی معصومانہ انداز میں ہو، ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔

اس ''ہلکے سے تموج'' کے بعد مولانا نے ''شاہ ولی اللہ اوراُن کی سیاسی تحریک'' لکھی (۴۲ء) جس میں حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ بریلوی، اہل صادق پور اور ان کے عام ماننے والوں پر انہوں نے نہایت سخت اور ناروا حملے کیے، ساتھ ساتھ نجد اور یمن کے مشہور اہل علم اور نامور محدثین کو بھی اس سلسلے میں دھر گھسیٹا۔ اس کتاب پر ایک مفصل تنقید ''معارف'' کے چار نمبروں (فروری، مارچ، اپریل، مئی ۴۳ء) میں شائع ہوچکی ہے، جو

اہل علم میں قبولیت کی نظروں سے دیکھی گئی۔ [1]

یہ کتاب اور الفرقان کا مقالہ دونوں اہل علم اور خواص کے لیے تھے، عام اور معمولی لکھے پڑھے لوگ ان سے اچھی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لیے ان کا دائرہ اثر ونفوذ بہت محدود رہا۔ ان کے برعکس زیر نظر کتاب مولانا کے ایک لائق شاگرد اور معتقد نے آسان زبان میں لکھی ہے جس میں ان کے تمام افکار یکجا اور پھیلا کر پیش کیے گئے ہیں، طرز بیان دلچسپ اور موثر ہے۔ واقعات تاریخی تسلسل اور افکار سلجھاؤ کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ غرض جہاں تک مولانا کے افکار و آراء کا تعلق ہے۔ یہ کتاب ان کے پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اور ہمیں یہ معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اس کتاب سے بالکل مطمئن ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ افکار کتاب وسنت کی روشنی میں کہاں تک قابل قبول ہوسکتے ہیں؟

کتاب تقریباً چار سو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور تقریباً پوری اسلامی تاریخ پر مولانا کا تبصرہ اس میں آگیا ہے۔ وحدت انسانیت، انقلاب، اسلامی تصوف، اسلامی افکار میں قومی وملکی رجحانات، اسلامی ہندوستان، اکبر اعظم، اورنگ زیب، شاہ ولی اللہ اور ولی اللہی سیاسی تحریک، مختلف ابواب کے ماتحت مولانا کے خیالات وافکار کی تشریح کی گئی ہے۔

مصنف کا مقدمہ بھی اچھا خاصہ دل آویز اور دلچسپ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس وقت کیسی ذہنی کشمکش اور فکری الجھاؤ میں گرفتار ہے۔

مولانا کے افکار کی تنقید اور مکمل جائزہ کے لیے بڑی فرصت اور پھیلاؤ کی ضرورت

---

(۱) یہ وہی مضمون ہے جو پہلے ''معارف'' میں ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک پی استدراک وتنقیح'' کے نام سے چھپا۔ پھر یہ مضامین کتابی شکل میں ''مولانا سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر'' کے عنوان سے پٹنہ سے شائع ہوئے۔ اور یہی وہ کتاب ہے جو قارئین ــــ صادقین صادق پور اور علمائے اہل حدیث ــــ مولانا عبید اللہ سندھی حنفی کے الزامات کا جائزہ ــــ کے عنوان سے گزشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ (ص۔ی)

ہے افسوس کہ نہ اس وقت ہمیں اتنی فرصت نصیب ہے اور نہ ایک رسالے کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش ہے، سرسری طور پر ہم اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ مولانا سندھی رحمہ اللہ، اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں تا کہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جز بن سکیں۔ اسی اعتبار سے وہ وحدت انسانیت اور وحدت ادیان کے قائل ہیں۔ مولانا کے نزدیک قرآن مجید بھی اسی ''بنیادی فکر'' کا ترجمان ہے۔

''اور یہ بنیادی فکر عالمگیر، ازلی، ابدی اور لازوال ہے۔ قرآن میں بے شک اس کا جامہ عربی ہے۔'' (۳۵)

لیکن یہ ''عربیت'' ''مشاہدۂ حق'' کے بیان میں صرف ''ساغر و مینا'' کے طور پر ہے، (ص ۳۵) اصل حقیقت تو وہی ہے، جو گیتا میں ہے، مولانا کے نزدیک گیتا حق ہے، لیکن اس کی جو غلط تعبیر کی گئی وہ کفر ہے، گیتا کے متعلق تو گیتا والے جانیں۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی ''وحدت انسانیت کا شارح ہے''۔ اور نہ وہ ''وحدت ادیان'' کا قائل ہے۔ اس کا حامل تو ایک ''دین حق اور'' ھدیٰ'' لے کر آیا تھا، تا کہ ساری کائنات اس کی پابند ہو۔ اور اللہ کی زمین پر اسی کا قانون نافذ ہو۔ مولانا جن قوانین و مذہبی اقتدار کو ''رسوم'' کہتے ہیں، وہ صرف رسوم نہیں، ان میں ''حدود اللہ'' بھی ہیں، اور ''حدود اللہ'' سے تجاوز کرنے والے کے لیے قرآن مجید کا لہجہ سخت ہے۔

لیکن ہمارے مولانا تو ''دین حق'' کی دائمی برتری گویا مانتے ہی نہیں، ان کے نزدیک اب ''قرآنی حکومت'' کا زمانہ گزر گیا اور گزری ہوئی چیز واپس نہیں آ سکتی۔

''جو زمانہ گزر گیا'' پھر وہ واپس نہیں آیا کرتا، جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں، قرآن پر عمل کر کے خلافت راشدہ کے دور اول میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے

ہیں وہ حکمت قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بے شک خلافت راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا نمونہ ہے، لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔'' (ص: ۴۷)

''حکمت قرآنی'' سے مولانا کی جو بھی مراد ہو۔ مگر ہم اسے 'شریعت' سے الگ نہیں سمجھتے جو حکمت شریعت سے بے بنیاز کر دے یا شریعت کو قرار واقعی اہمیت نہ دے، قرآنی حکمت نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا کے افکار میں یہ چیز بری طرح کھٹکتی ہے کہ وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔

''مولانا نے فرمایا کہ میں دین کو اسی بناء پر انسانیت کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فرد انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے یا اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دین حق مان لیا ہے اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا، اس کو کافر قرار دیا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصود حقیقی ہے وہ ان کے ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں۔''

جانے، ظاہری طور طریقوں سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ کیا نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ کی ادائی، حج ادا کرنا، یہ سب ظاہری طور طریقے ہیں؟ اور جو ان کا قائل نہ ہو، وہ رب العالمین کی بارگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے؟ اور پھر ہمیں بتایا جائے کہ ''محدود مذہب'' سے مراد کیا ہے؟ کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلامی تصوف کے باب (ص: ۱۲۴۔ ۱۶۳) میں مولانا کا بیان بہت دلچسپ، مفید اور سبق آموز ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ موجودہ ہندی تصوف کا بڑا حصہ ویدانت اور ہندو یوگیوں کے طریقوں سے ماخوذ ہے۔ ''اصل جذبۂ تصوف'' جسے حدیث میں ''احسان'' کہا

گیا ہے۔ یقینی خالص اسلامی چیز ہے۔ لیکن موجودہ فن تصوف، تزکیہ اور ریاضت کے نت نئے طریقے۔ بیرونی اثرات کی غمازی کرتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

"ہمارے بعض علماء اس سے بہت چڑتے ہیں۔ انہیں یہ گراں گزرتا ہے کہ مسلمان صوفیاء نے ہندوستان کے ویدانت سے استفادہ کیا، چنانچہ وہ ایسے تصوف کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں... ان ارباب علم و فضل کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ ایک ہے جذبۂ تصوف اور ایک ہے علم تصوف، اس جذبۂ تصوف کو حدیث شریف میں احسان کا نام دیا گیا ہے... اور جس طرح اور علوم کی تدوین میں دوسری قوموں کی تحقیقات اور تلاش و جستجو سے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح تصوف کے طرق میں بھی دوسری قوموں سے استفادہ کیا گیا۔" (ص ۱۳۰-۱۳۱)

"اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے۔" (ص: ۱۳۱)

"یہاں پر ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا۔ اور ہندوستان کے مسلمان صوفیا نے نفس باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لیے ہندو یوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے۔" (ص: ۱۳۲)

بہرحال حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے، رہے ہمارے صوفی علماء تو ان کی خفگی بجا ہے۔ یہ بزرگان دین، اور اللہ کے مرتاض بندے ان صوفیانہ ریاضتوں کو خالص اسلامی چیز سمجھتے ہیں۔ جب آپ کہیں گے کہ یہ چیزیں ہندوؤں سے لی گئی ہیں تو ان کا نفس طبعی طور پر اس تلخ حقیقت کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

لیکن مولانا کا مطلب دوسرا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمان صوفیوں نے ہندو یوگ کو منقح کیا۔ اس کی اصلاح کی، اور پھر اسی کو پاکیزہ شکل میں ہندوؤں کے سامنے پیش کیا۔

''یہی وجہ ہے کہ ہمارا تصوف ہر سمجھ دار ہندو کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔
مولانا کا خیال ہے کہ اگر فرقہ وارانہ تعصّبات نہ ہوتے اور ہندوؤں کے دلوں
میں مسلمان کی ہر چیز سے نفرت نہ پیدا کر دی جاتی، تو کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمان
عارفین کے فیض سے ہر ہندو کے دل میں اسلامی تصوف گھر کر لیتا۔ اور
ہندوستان کے سمجھدار طبقے اسلام کے گرویدہ ہوجاتے۔'' (ص:۱۳۳)

مگر سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ فرقہ وارانہ تعصّبات شروع سے موجود ہیں اور ہندوستانی قومیت سے میل کی کوئی کوشش بھی ہندوؤں کو اسلام سے قریب نہیں لاسکتی۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کھینچا تانی میں کچھ اسلام ہی کا رنگ پھیکا پڑ جائے۔ یہ کوئی خواہ مخواہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اکبر اور دارا شکوہ کی نامبارک کوششوں کا یہی انجام نہیں ہوا؟

اسلامی تصوف کی طرح تاریخ اسلام کا بھی مولانا نے اپنے نقطۂ نظر سے نہایت گہرا جائزہ لیا ہے۔ اُن کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ:

''اسلام گو بین الاقوامیت کی دعوت ہے۔ مگر وہ قومیتوں کا انکار نہیں
کرتا۔'' (ص:۱۹۶)

وہ انسانیت، بین الاقوامیت اور قومیت تینوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ عقیدۂ وحدۃ الوجود ان کے انسانی فکر کا ترجمان اور مظہر ہے۔ بین الاقوامیت کی جگہ وہ وحدت ادیان کو دیتے ہیں۔ قومیت کی تعبیر وہ خاص دین یا شریعت سے کرتے ہیں، وہ بیک وقت ان تینوں چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

''عقیدہ وحدۃ الوجود، وحدت ادیان اور ایک مستقل دین کی جو
بالترتیب جدا جدا حیثیتیں ہیں۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ مولانا
نے فرمایا کہ ان کی مثال انسانیت، بین الاقوامیت اور قوم کی ہے۔ میں

انسانیت عامہ پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اسی بنا پر میں بین الاقوامیت پر بہت زور دیتا ہوں۔ لیکن انسانیت اور بین الاقوامیت پر عقیدہ رکھنے سے میرے نزدیک یہ لازم نہیں آتا کہ قوم کے مستقل وجود کو نہ مانا جائے۔ قوم بین الاقوامیت اور انسانیت ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بعینہ میرا شخصی عقیدہ، میرا قومی اور ملی مذہب، وحدت ادیان اور وحدۃ الوجود، ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں۔" (ص ۱۵۱)

گویا اسلام کی حیثیت آپ کے نزدیک صرف ایک قومی و ملی مذہب کی رہ گئی۔ وہ ایک "عالمگیر دین" نہیں رہا۔ لکھتے ہوئے جی کڑھتا ہے، پر کیا کیا جائے کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ایسا ہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہماری ناقص سمجھ کا قصور ہو۔

اسی قومیت اور وطن پرستی کے نشے میں مولانا عربوں اور عربی زبان اور "عربی قرآن" کے بارے میں ایسی باتیں کہہ گئے ہیں ہمارے نزدیک اسلام کی روح کے سراسر خلاف ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"... بے شک... قرآن کا پیغام سب قوموں کے لیے تھا۔ لیکن آپ کی بعثت کا پہلا مقصد یہ تھا کہ قریش کی اصلاح و تہذیب ہو جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک قومی اور دوسری عمومی اور بین الاقوامی۔" (ص: ۱۹۱)

"... اس ذہنیت کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی متن کی تلاوت کرنا ثواب ٹھہرا..." (ص ۱۹۲)

فہم قرآن پر زور دینا اور بات ہے، اور تلاوت کے ثواب سے محروم کرنا دوسری بات ہے۔ غالباً مولانا "تلاوت قرآن" کے ثواب کے منکر نہیں، عربی برتری اور عربی تفوق کی تردید میں شاید ان کی زبان سے نکل گیا ہو۔

"اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔ وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا

ہے۔ اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے۔ وہ قومیت جو بین الاقوامی قومیت کے منافی ہو وہ اس کے نزدیک بے شک مذموم ہے، لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے۔ مولانا کے خیال میں یہ ناممکن ہے۔ (ص:۱۹۶)

''اسلام کی دعوت ''لا قومیت'' کی دعوت نہیں تھی بلکہ اس نے قریش کی قومیت کو ایسی شکل دے دی کہ وہ بین الاقوامیت کے مرکز بن گئے۔'' (ص:۲۰۰)

ایک مسلم کی حیثیت سے ہمیں مولانا کے اس ''فکر'' کے قبول کرنے سے انکار ہے۔ اسلام قومیتوں کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں، اسلام قومیت کی تعمیر نہیں کرتا، وہ ''حزب'' کی تشکیل کرتا ہے۔ اسلام نے چند ''اصول و مبادی'' پیش کیے ہیں جو انہیں قبول کرتا ہے ان پر ایمان رکھتا ہے اور انہیں اپنی زندگی کا دستور العمل بناتا ہے۔ وہ اس ''حزب'' کا رکن ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اسلام کی بین الاقوامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے، نسل اور جغرافیہ والی قومیت کا تصور بھی اس کے قریب نہیں پھٹکنے پاتا۔ اصل یہ ہے کہ مولانا کے دل و دماغ پر روس اور اسٹالن چھائے ہوئے ہیں۔ جس طرح اسٹالن اشتراکیت کے اصولوں میں ترمیم کر کے اسے قومی رنگ دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا بھی اسلام کو قومی لباس پہنانا چاہتے ہیں، وہ ایسی قومی پارٹی بنانا چاہتے ہیں جو بین الاقوامی رجحان رکھتی ہو۔ اسی لیے وہ ٹروٹسکی جیسے ''مومن قانت'' اشتراکی کے مقابلے میں، اسٹالن جیسے ہوشیار اور زمانہ ساز کو پسند کرتے ہیں... یہ سب کچھ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں؛ زیر نظر کتاب میں پورے نو صفحے (۲۲۰-۲۲۹) اسلام اور اشتراکیت کی مماثلت کے نذر کیے گئے ہیں، افسوس کہ مضمون کہ تنگ دامانی، طول طویل اقتباس کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے صرف اس کا ابتدائی حصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں! جس میں اس ''مشابہت و مماثلت'' سے براءت ظاہر کی گئی ہے۔

''حاشا و کلا، ہمارا مقصود یہاں کسی قسم کا مقابلہ کرنا نہیں ہے، اور نہ کسی

طرح کی مشابہت ثابت کرنے کی غرض ہے، لیکن تاریخ اسلام کے ان ادوار کو سمجھنے میں اس زمانے کی ایک اور بین الاقوامی تحریک سے بڑی مدد مل سکتی ہے؛ خوش قسمتی سے یہ تحریک ہمارے سامنے اٹھی، ابھری اور پھیلی اور مختلف مراحل سے گزری ہے... ہماری مراد اشتراکیت کی تحریک سے ہے۔'' (ص:۲۲۰)

غرض تو ''مشابہت'' ثابت کرنے کی نہیں ہے، لیکن اسلام کے تاریخی ادوار کو آپ دیکھتے ہیں اشتراکیت ہی کی تاریخ کی روشنی میں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں بھی ایک موقع۔ (ص ۱۲۳، حاشیہ) پر یہ مماثلت پیش کی گئی ہے۔

اس قومیت کا فیض ہے کہ مولانا سندھی کی آزاد طبیعت پر تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کی تنقید بھی شاق گزرتی ہے، ''بدقسمتی'' سے ہندوستان کے ممتاز مسلمان اہل قلم بھی ''عربیت'' کے دلدادہ ہیں، اس لیے ان سے بھی ہمارے مولانا خوش نہیں۔

''...ان کے (یعنی عربوں کے) اہل قلم نے تاریخ اسلام کے غیر عربی دور کو ہمیشہ زوال، نکبت اور بے دینی کا عہد ثابت کیا، اسلام کی تاریخ کا یہ تصور ٹھیک نہیں، ہماری بدقسمتی ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان اہل علم میں سے جن لوگوں نے بھی تاریخ اسلام پر کتابیں لکھیں، وہ عربی تصنیفات سے بہت متاثر ہوئے اور چونکہ عربی زبان کو ہمارے ہاں مقدس سمجھا جاتا ہے اور اس زبان میں جو کچھ بھی لکھا ہوا ہو، اس کو الہام کا درجہ دیا جاتا ہے، اس لیے یہ خیال ہندوستان کے اہل قلم میں بھی عام ہو گیا۔'' (ص:۲۴۰)

ہم مولانا کو یقین دلاتے ہیں کہ عربی زبان میں لکھی ہوئی ہر چیز کہیں بھی ''الہامی'' نہیں خیال کی جاتی۔ عربی زبان میں الہامی اور مقدس چیز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے کتاب اللہ، جس کے تقدس سے شاید ان کو بھی انکار نہ ہو۔ رہی تاریخ اسلام کے بعض غیر عربی ادوار کی تنقید و تنقیص، تو اس کے ذمہ دار وہ عجمی ہیں جو اسلام کی صراط مستقیم سے دور جا

پڑے۔

قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ اچھے خاصے ہوشمند مفکر اور وسیع النظر عالم کو راہ اعتدال سے کتنا دور لے جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مولانا کے ان خیالات سے ہو سکتا ہے جو زیر نظر کتاب میں ''اسلامی افکار میں قومی اور ملکی رجحانات'' کے عنوان سے مرتب کیے گئے ہیں۔ (ص:۲۴۲۔۲۷۲)

> ''یہ صحیح ہے کہ دین اسلام کسی ایک ملک، قوم یا زمانہ کے لیے مخصوص نہیں، اسلام تمام انسانیت کا دین ہے اور قرآن کریم انسانیت کے اسی دین کا ترجمان (اور قانون) ہے۔''
>
> ''اس عالمگیر قانون کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے، جو زمانہ، ماحول اور اہل حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی۔ اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں۔'' (ص:۲۴۲)

آپ سمجھے یہ ''حجازی تعبیر'' کیا چیز ہے؟ ہم سیدھے سادے مسلمان تو اسے محض ''حجازی تعبیر'' کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس کا اصلی نام سنت ہے۔ جو قرآن پر زائد تو نہیں لیکن اس کی تفصیل و تشریح ضرور ہے۔ ائمہ اسلام ''سنت'' کو کتاب اللہ سے الگ نہیں قرار دیتے بلکہ اسی کا تتمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں:

> ''دین عرف قرآن میں منحصر ہے۔ اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے... اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی، لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانون اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم ''سنت'' انہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں۔''

''سنت'' مولانا کے نزدیک حجازی یا مدنی سوسائٹی کی ترجمانی ہے، اس لیے اس میں ان کے نزدیک تبدیلی ہو سکتی ہے، یہ ''نظر عنایت'' ''سنت'' ہی پر بس نہیں کرتی، بلکہ اس کے بعد ایک قدم آگے بڑھ کر وہ قرآن کے احکام کو بھی ابدی اور عالمگیر نہیں مانتے۔

''مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں، عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جا سکتی تھی۔'' (ص: ۲۵۴)

ایک دوسرے انداز میں اس کی تشریح ملاحظہ ہو:

''مولانا فرماتے ہیں کہ نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول ہی سے بنتی ہے مثلاً ہندوستان میں فطرتاً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں اس لیے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے (یعنی اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کر لے) تو اس کا یہ فعل خلاف نبوت نہ ہوگا۔'' (ص ۲۵۵)

یہ سب اسی جذبۂ وطن پرستی کے مظاہر ہیں جو مولانا کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جس کی کھوج میں انہوں نے مسلمانوں کی پوری تاریخ کھنگال ڈالی ہے۔

احکام قرآنی کی تبدیلی اور تفسیر کے متعلق ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو، جو بالکل واضح ہے، اور کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔

''غیر عرب اقوام کے لیے اس پیغام (یعنی قرآن کریم) کو جو بظاہر عربی شکل میں تھا، اپنانے میں جو دقتیں پیش آئیں، انہیں دو طرح سے حل کیا گیا۔ عربوں کو دوسری قوموں پر حکمرانی حاصل ہو گئی تھی، ان قوموں کے عوام نے تو شریعت کو اس لیے مان لیا کہ یہ حکمرانوں کا قانون تھا... البتہ دوسری قوموں

کے خواص کے لیے اس قانون کو اپنانے میں جو رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یوں دور ہوگئی کہ اس قانون میں لچک تھی۔ غیر عرب اقوام کے خواص کو اجازت تھی، اگر وہ چاہیں تو عربی قانون کو بجنسہ قبول کر کے عرب بن جائیں یا اس کی روشنی میں اپنے لیے ایک قومی قانون بنالیں۔'' (ص: ۲۶۱)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ''لچک'' سے مولانا کیا مراد لیتے ہیں؟ پھر اگر ''لچک'' کی تاویل بھی کر لی جائے تو ''قومی قانون'' کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، رہ رہ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ سب اسی ''وطنیت'' کے جراثیم ہیں، جو مولانا سندھی جیسے دیدہ ور اور نکتہ رس عالم کو کعبہ سے ترکستان کی طرف لیے جارہی ہے، ان کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں۔ عارف سیالکوٹی رحمہ اللہ نے کتنا سچ کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
(اقبال)

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، راقم اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھا تھا کہ جذبۂ وطنیت کی بھی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہوگی، مگر مولانا سندھی کے ''افکار و سیاسی تعلیمات'' سے واقفیت کے بعد اس خیال کی غلطی آشکارا ہوگئی۔ مسئلہ خلق قرآن اور اس کی ''قومی تشریح'' پر مولانا نے جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں، ان کو پڑھ کر یقین ہوگیا کہ اس جذبۂ وطن پرستی کی کوئی حد نہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی فتنہ سامانیاں کہاں جا کر دم لیں گی، ممکن ہے بعض سیدھے سادے عقیدت مندوں کو یہ جملے ناگوار معلوم ہوں، مگر راقم ان سے ذرا صبر کی درخواست کرے گا آیئے ذرا جی اکڑا کر کے مسئلہ خلق قرآن کی ''قومی تعبیر'' سن لیجئے۔ اس کے بعد آپ کو فیصلے کا حق ہوگا۔ اب تک اشتراکیوں کی یہ خصوصیت مشہور تھی کہ وہ دنیا کی تاریخ کی تعبیر معاشی عوامل کے ذریعے کیا کرتے ہیں مگر اب معلوم ہوا کہ وہ اس خبط میں منفرد نہیں،

ہمارے بعض ارباب فکر کا بھی یہ کمال ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کی تشریح وتعبیر ''قومی نقطہ نظر'' سے کر لیتے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''مامون کے زمانے میں خلق قرآن کا بھی مسئلہ اٹھا، ایک گروہ کہتا تھا کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے۔ وہ تو قدیم ہے، لیکن جو الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے، وہ مخلوق اور حادث تھے، محدثین کہتے تھے کہ ''کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔'' مامون نے پہلے گروہ کی حمایت کی اور اس خیال کو سلطنت کا اصولی مسئلہ بنا دیا، اور محدثین کی قیادت امام حنبل (احمد بن حنبل رحمہ اللہ) نے فرمائی، خلق قرآن کے اس نزاع کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ مامون کے زمانے میں عربوں کے ہاتھ سے سیادت کے سب ذرائع چھن چکے تھے، لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے۔ عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے۔ لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، عربی الفاظ پر زور دینے والے حقیقت میں عربی تفوق کے قائل تھے....''

''محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے، اور یا اس مسئلے کو گول ہی رکھا جائے کیوں کہ عربی الفاظ کو مخلوق ماننے سے عربی تفوق پر زد پڑتی تھی۔'' (ص:۲۶۶)

ان ''افکار زریں'' کو پڑھیے اور مولانا کی جودتِ طبع کی داد دیجیے، پھر مسلمانوں کی بدقسمتی کا ماتم کیجیے کہ ان کے اہل نظر وفکر راہ حق سے کس قدر دور ہوتے جا رہے ہیں؟ فتنہ خلق قرآن کی یہ تشریح بالکل غلط، اور واقعات کے خلاف ہے، بات اتنی تھی کہ مامون کو مناظرہ کا شوق تھا۔ عیسائیوں سے مناظرے میں ''کلام اللہ'' کو حادث کہا گیا۔ کہ عیسیٰ

(علیہ السلام) ''کلمۃ اللہ'' ہوکر مخلوق ہوئے، تو پھر قرآن کلام اللہ ہوتے ہوئے کیوں مخلوق اور حادث نہ ہو: [۱] اُدھر سے مطالبہ ہوا کہ ''تمہارے علماء تو قرآن کو مخلوق اور حادث نہیں کہتے؟ '' حکومت کا نشہ برا ہوتا ہے۔ دیر کیا تھی، دربار میں علماء کی طلبی ہوئی، کمزور دل والے، اور زمانہ ساز علماء کی کبھی کمی نہیں رہی... لیکن انہی میں چند ایسے ارباب عزیمت و استقامت بھی تھے، جنہوں نے پوری پامردی اور بہادری کے ساتھ اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ انہیں اذیتیں دی گئیں قید خانوں میں طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ لاکھوں کے مجمع میں بلا بلا کر دُرّے مارے گئے۔ بدن زخموں سے چور ہوگیا۔ مگر یہ اللہ کے بندے راہ حق سے نہ ہٹے۔ اور تاریخ پر ایک مستقل نشان چھوڑ گئے۔ آج پوری اسلامی تاریخ میں حسین بن علی (رضی اللہ عنہ وعن والدیہ) کے بعد احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا موقف اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ دنیاوی اور مادہ پرست تحریکوں سے مقابلہ مقصود نہیں، مگر بہ سبیل تفنن عرض کیا جاتا ہے کہ اگر مولانا کا جی چاہے تو انقلاب روس اور جدید ترکی کی تاریخ کھنگال کر دیکھ لیں ابن حنبل رحمہ اللہ کی استقامت اور برداشت کی مثال مشکل سے ملے گی:

اولٰئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ذہانت اور اُپج سے ایک انوکھی بات کہہ دینا آسان ہے مگر اسے ثابت کرنا مشکل ہے، کہاں عربی تفوق کا جذبہ، اور کہاں ابن حنبل اور ان کے رفیقوں کا ''افضل الجهاد'' شتان ما بين الارض والسماء مولانا سندھی نے بھی زیادتی اور ظلم کی حد کردی، ابن حنبل رحمہ اللہ کا تو یہ عالم تھا کہ درے پڑ رہے ہیں۔ تہبند کھلا پڑتا ہے، بدن لہولہان ہو رہا ہے۔ وقت کا سب سے بڑا شہنشاہ (معتصم باللہ) کہتا ہے کہ اب بھی کہہ دو صرف زبان

---

(۱) اس کا سراغ الندیم کے ایک بیان سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (کتاب الفهرست مقاله خامسة فن ثالث ترجمہ ابن کلاب: ص ۱۸۰، طبع یورپ)

سے مخلوق کا لفظ ادا کردو، مگر لب پر جاری ہوتا ہے، تو یہ مشہور و ماثور فقرہ:

"اعطونی شیئاً من کتاب اللہ عز و جل او سنۃ رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اقول بہ. (جلاء العینین ص:۱۱۴، ص۱۰۱)

مگر یہ یورپ کی مادیت کا لوہا ماننے والے کہتے ہیں کہ وہ پیکر صداقت و عاشق سنت صرف عربی زبان اور عربی تفوق کی خاطر اپنی جان گنوانے پر تلا ہوا تھا! اللہ جانتا ہے کہ ان ائمہ صدق و صفا کے ایمان و اخلاص پر اس سے زیادہ بدنما بہتان نہیں اٹھایا جا سکتا۔

وَسَيَعۡلَمُ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ أَيَّ مُنقَلَبٖ يَنقَلِبُونَ (الشعراء:۲۲۷)

مولانا کہتے ہیں کہ "محدثین کا اصرار تھا کہ قرآن کے الفاظ کو غیر مخلوق مانا جائے، یا اسے گول مول ہی رکھا جائے۔" اس "گول مول" کی حقیقت یہ ہے کہ سلف کا ایک طبقہ صفات باری کے باب میں انتہائی محتاط تھا امام مالک کا مشہور قول ہے۔ "الاستواء معلوم والکیف مجهول والسوال عنہ بدعۃ" اسی طرح کلام الٰہی کے بارے میں ایک طبقہ کہتا تھا۔ "القرآن کلام اللہ لا اعرف مخلوق او غیر مخلوق"۔

"یہ گول مول ضرور ہے مگر ٹال مٹول کا گول مول نہیں، اس اجمال کی تہہ میں عقیدہ کی پاکیزگی اور ایمان کا رسوخ ہے۔ اور یہ چیز استہزاء کی بجائے رشک کی مستحق ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور مولانا فرماتے ہیں:

"عجمی مسلمان قرآن کی تعلیم تو من جانب اللہ مانتے تھے، لیکن قرآن کے الفاظ کو وہ قرآن کے معانی یعنی اصل تعلیم کی طرح قدیم اور غیر فانی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔"

اس پر چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) دور عباسی کے وہ کون عجمی مسلمان تھے؟ کیا عقیدہ خلق قرآن کے قائلین اور منکرین کی تقسیم نسل اور قومیت کی بنیادوں پر تھی؟

(۲) قرآن کے الفاظ کو غیر قانونی تسلیم کرنے کے معنی یہ تو نہیں کہ وہ من جانب اللہ بھی نہیں؟ مولانا کے بعض بیانات سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے:

''دراصل بات یہ ہے کہ ایک عجمی کی عقل یہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اللہ کی تعلیم جو تمام زبانوں اور سب دنیا کے لیے ہے وہ عربی اسلوب بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند ہو۔ عجمی ذہن کے لیے قرآن کے الفاظ کا غیر مخلوق سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا۔'' (ص ۱۶۷)

''وہ تو معانی ہی کو قرآن سمجھے گا ــ اس فقرے سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں کچھ اور تو نہیں مراد لیا جارہا ہے؟ مولانا یہ بھی فرماتے ہیں:

''مامون کے زمانے میں عربوں کے پاس لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی، اور اب وہ اسے خاص الٰہی زبان منوانے پر مصر تھے۔'' (ص:۲۶۶)

دریافت یہ کرنا ہے کہ آپ عربی زبان کو کسی درجہ میں الٰہی زبان مانتے بھی ہیں؟ ''خاص و عام'' کی بحث تو بعد کی چیز ہے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، مسلک بالکل صاف ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو اس میں شک کرے، اس کے کفر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ یہ اللہ کا کلام (قرآن مجید) عربی زبان میں ہے تو اب عربی زبان الٰہی زبان ہوئی یا نہیں؟ مگر آپ کی عجمیت تو صرف ''معانی ہی کو قرآن سمجھتی ہے۔'' اور آپ کے نزدیک اللہ کی تعلیم ''عربی اسلوب بیان اور عربی نظم الفاظ کی پابند'' ہو ہی نہیں سکتی۔

اب یہ باب ختم ہوتا ہے، آخر میں ایک قومی نعرہ اور سن لیجئے۔ نعرہ ہے تو وطن پرستانہ مگر زبان علم اور حکمت کی اختیا کی گئی ہے۔

''مولانا کے نزدیک دہلی بھی دمشق و بغداد اور بخارا کی طرح مسلمانوں کے ایک مستقل مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح عرب مسلمان ایک

مستقل قوم تھے۔ اور ان کا سیاسی مرکز دمشق اور بغداد رہا۔ اور ایرانی مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور انہوں نے بخارا کو اپنا مرکز بنایا اسی طرح ہندوستانی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان ہے۔ اپنا فقہی مذہب ہے۔ اپنا علم کلام اور خاص حکمت ہے۔ جس طرح ایرانیوں نے عربوں سے اپنی قومی شخصیت منوائی۔ اور ایرانی زبان، ایرانی فقہ، ایرانی علم کلام، ایرانی تمدن مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کا ایک مستقل جزء بن گئے اسی طرح ہندوستانی مسلمان بھی ایک مستقل قوم ہیں۔'' (ص: ۲۷۲)

ایرانیوں نے جس طرح اپنی قومی شخصیت منوائی، اس کی بڑی دردناک داستان ہے۔ اس کا ذکر نہ چھیڑا جاتا تو اچھا تھا۔ رہا مسلمانان ہند کا ''اپنا فقہی مذہب'' تو ہمیں اس کا علم نہیں ان کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے جو صرف ہندوستان میں محدود نہیں امام اعظم اور ان کے جانشینوں کا مرتب کردہ فقہ افغانستان، ترکستان اور عربی ملکوں میں بھی رائج ہے۔ نیز خود اہل ہند کی ایک بڑی تعداد ''اہل حدیث'' ہے جو محدثین کے طریقے پر چلنا اپنے لیے سرمایہ سعادت خیال کرتی ہے۔ ممکن ہے مولانا کا دماغ، ان کا فکری وجود تسلیم نہ کرتا ہو مگر ان کا وجود ہے اور نہایت نمایاں۔ موجودہ ہندستان کے بعض چوٹی کے علماء عقائد اور فقہ دونوں میں محدثین اور سلف کا مسلک رکھتے ہیں۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ ''ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں۔'' اب اس کی دلیلیں ملاحظہ فرمایئے:

''اکبر تغلقوں کی طرح نہ تو قاہرہ کے عباسی خلفاء کی دینی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا اور نہ اسے اپنے باپ ہمایوں کی تقلید میں ایران کے شیعہ بادشاہوں کی سرداری گوارا تھی۔ چنانچہ اس نے ہندوستان میں ایک مستقل صاحب اقتدار سلطنت کی بنیاد رکھی، یہ خالص ہندوستانی سلطنت کی ابتداء تھی۔'' (ص: ۲۸۸)

یہ ہے مولانا کی ''ہندوستانی سلطنت'' کا نمونہ جس کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ اکبری بدعات کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے جہاد سے کون واقف نہیں؟ اس کی تازہ تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے:

''بدقسمتی سے ہندوستان کے حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ اس فکر سے ملک کی سیاسی زندگی میں خاطر خواہ نتائج نہ نکل سکے، بات یہ ہے کہ جس طرح مامون کے اقدام سے عربی ذہن کے تفوق پر زد پڑتی تھی... اسی طرح اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں نے محسوس کیا کہ اکبری مسلک سے اسلام کی برتری کو صدمہ پہنچنے کا اور اس کے ساتھ ان کی سیادت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ یہاں بھی اکبری فکر کے خلاف بغاوت ہوئی اور عالم گیر کے زمانے میں امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے رجحان کو حکومت کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔'' (ص:۳۸۹)

گویا امام ربانی بھی مسلمان حکمران طبقوں کے جذبۂ سیادت وتفوق کی تبلیغ کر رہے تھے۔ کہاں کی بات کہاں جا پہنچتی ہے؟

''ہندوستانی قومیت'' کے پرستاروں کے نزدیک ''اکبر اعظم'' سے زیادہ چہیتا کون ہو سکتا ہے۔ طبعی طور پر مولانا اس کے بڑے مداح ہیں:

''چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرمانروا ہے، جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی اور اسلام کے اصول وقوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور ان کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش۔'' (ص ۲۹۳)

بالکل صحیح! یقیناً اکبر کی حکومت ہندوستانی قومیت اور ہندو تمدن و تہذیب کو زندہ کرنا

چاہتی تھی، مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے اصول وقوانین کے اندر رہ کر ایسا کرنا ممکن بھی ہے؟

''مولانا کے نزدیک وحدت الوجود کا عقیدہ اکبر کے فکر کی اساس تھا اور اسی پر اس کے دین کی بنیاد رکھی گئی تھی۔'' (ص۲۹۶-۲۹۷)

معلوم نہیں ''وحدت الوجود'' کے ماننے والے مولانا کے اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ اسی سلسلے میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

اکبری سیاست ایک دینی فکر کا نتیجہ تھا جس کا اساس وحدت الوجود کا عقیدہ تھا... جہانگیر کے زمانے میں امام ربانی نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کی تردید کی اور اس پر جس سیاست کی بنا پڑی تھی اسے غلط ٹھہرایا۔ امام ربانی کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے بااقتدار سرداروں سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی اور یوں بھی مسلمانوں کے حکمراں طبقوں کا ان کی طرف مائل ہونا ایک طبعی امر تھا۔'' (ص:۳۰۷)

دیکھئے وہی بات مولانا دوسرے انداز میں کہہ رہے ہیں، کہنا یہی چاہتے ہیں کہ امام ربانی اس وقت کے مسلمان حکمران طبقوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور انہیں اکبر کی بدعات اور اس کے بداندیش وزیروں کی بیہودہ حرکتوں سے کوئی خاص اصولی اختلاف نہیں تھا۔ ورنہ مولانا سے زیادہ اسے کون جانتا ہے کہ معاملہ صرف ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کا نہیں تھا، معاملہ دین کا تھا۔ اکبر نے اس دین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔ اگر حضرت امام ربانی مجاہدانہ میدان میں نہ آتے تو نہ اورنگ زیب پیدا ہوتا اور نہ ہم آپ اس حال میں ہوتے ــــ لیکن ہمارے مولانا ہیں کہ اکبر کی شہنشاہیت کو ''ہندوستانی اسلامی حکومت'' کا نام دیئے جا رہے ہیں:

''اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندوستانی اسلامی حکومت تھی، اس کے سیاسی مسلک میں ہندوستانیت کو اسلامیت پر ترجیح دی گئی تھی، کیوں کہ

ابتدائے کار میں اسلامی حکومت کو ہندوستانی بنانے کے لیے لابدی طور پر ہندوستانیت پر زیادہ زور دینا چاہئے تھا۔'' (ص:۳۰۹)

خاکسار عرض کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت ہندوستان میں تھی کہاں؟ جسے اکبر اور اس کے جانشین ''ہندوستانی'' بنانا چاہتے تھے۔ مغلوں سے پہلے کی مسلمان حکومتوں کو کسی حال میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں! وہ مسلمانوں کی حکومتیں تھیں جن میں بادشاہ اچھے بھی ہوتے تھے اور برے بھی۔ اکبر پہلا بادشاہ ہے جس کے دور میں وہ مسلمانیت بھی ختم کردی گئی، اور صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ دین ہی کے بیخ و بُن سے اکھاڑنے کی مہم شروع کردی گئی اور ایک نئے ''دین الہٰی'' کی بنیاد ڈالی گئی۔ ممکن ہے مولانا کے نزدیک یہ ''ہندوستانیت'' ہو مگر کتاب وسنت رسول اللہ پر ایمان رکھنے والا اسے الحاد و زندقہ سمجھنے پر مجبور ہے۔

اورنگ زیب کی دینداری اور مذہبی پالیسی کی توجیہ بھی مولانا نے مخصوص انداز میں کی ہے جو سننے کے لائق ہے۔ ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم تھا کہ عالمگیر حجاز پر بھی اپنا اقتدار چاہتا تھا اور اس کی سیاست کی تہہ میں اسلامی دنیا کی قیادت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ہم مولانا کو جھٹلانے کی جرأت تو نہیں کر سکتے البتہ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ سازی کے لیے بھی کچھ قرائن وشہادت کی ضرورت ہوا کرتی ہے —— بہرحال مولانا کی توجیہ ملاحظہ ہو:

''اکبر کی سلطنت ہندوستانی اسلامی سلطنت تھی، اورنگ زیب چاہتا تھا کہ وہ اس ہندوستانی اسلامی سلطنت کے دائرہ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائیں اور حجاز پر بھی اس کا اقتدار ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا۔۔۔ اورنگ زیب کے پیشِ نظر ہندوستان کے علاوہ اسلامی دنیا کی قیادت تھی اس لیے اس نے اسلامیت کو مقدم جانا۔''

مولانا کو ''جمع اضداد'' میں کمال حاصل ہے۔ وہ اکبر اور عالمگیر دونوں کے مداح ہیں۔ اکبر پر اس لیے فریفتہ ہیں کہ اس نے خالص قومی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور عالمگیر کی یہ ادا انہیں بھاتی ہے کہ اس نے بیرون ہند میں ہندوستان کی عظمت کا جھنڈا بلند کیا۔

''دوسرے لفظوں میں اشوک سے ہزار ہا سال کے بعد ایک بار پھر ہندوستانی اس قابل ہوئے کہ وہ دوسروں کی سیاسی اور فکری ترکتازیوں کی آماجگاہ بننے کے بجائے اپنا پیغام باہر کی دنیا کو سنائیں۔ گو اشوک کے زمانے میں یہ پیغام بدھ مت کا تھا اور عالمگیر کے عہد میں یہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا پیغام تجدید اسلام تھا۔'' (ص:۳۱۶)

''فکری ترکتازیوں'' کا فقرہ قابل غور ہے۔ شاید مولانا کے نزدیک اسلام اور متقدمین ائمہ اسلام کے اثرات بھی ''فکری ترکتازیوں'' میں داخل ہوں۔

مولانا سندھی ہندوستان میں حکمت ولی اللہی کے داعی ہیں اور انہیں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتابوں پر بے نظیر عبور حاصل ہے، مگر وہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے افکار جس طرح پیش کرتے ہیں اس سے خود شاہ صاحب رحمہ اللہ سے بدگمانی ہونے لگتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی اکبر اور عالمگیر دونوں کے قائل تھے ــــ شاہ صاحب رحمہ اللہ اکبر کے قائل ہوں، اس کی سیاست کے ثناخوان ہوں، بات ناقابل اعتبار ہے جب تک صریح شہادت نہ پیش کی جائے ــــ بہرحال مولانا کا بیان ملاحظہ ہو:

''...اہل فکر کی یہ جماعت سلطنت کے ان لوگوں سے واقف تھی، وہ اکبر کے سیاسی اعمال کے حامی نہ تھے لیکن جس نہج پر اکبر نے مختلف ملتوں کو ہم نوا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اصولاً اس سے متفق تھے بی اسی طرح وہ عالمگیر کی اسلام پرستی کے قائل تھے، لیکن اسلام پرستی نے امور سلطنت میں جو سخت گیری کی روش اختیار کی تھی، اس کے خلاف تھے۔ شاہ ولی اللہ کے والد شاہ

عبدالرحیم اور ان کے ہونہار فرزند امام ولی اللہ ان کے افکار کے مرتب کرنے والے ہیں۔'' (ص: ۳۱۹)

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مصنف اس ''نہج'' سے اصولی طور پر متفق ہو جو اکبر نے مختلف ملتوں کو ایک کرنے کے لیے اختیار کیا تھا؟

زیر نظر کتاب میں ایک باب شاہ ولی اللہی سیاسی تحریک پر بھی ہے۔ (۳۳۱۔۳۴۰) یہ گویا مولانا کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک کا خلاصہ'' ہے۔ اس خلاصہ میں بھی نجد و یمن کے محدثین، عام اہل حدیث اور بدنام و مظلوم وہابیوں پر نظر عنایت مبذول ہوئی ہے۔ (ص: ۳۳۵) جسے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ (معارف: فروری، مئی، ۱۹۴۳ء)

کانگریس پر بھی مولانا کے افکار قابل دید ہیں۔ (ص: ۳۴۱، ۳۴۷) مگر ہمیں ان کی توضیح و تشریح سے اتفاق نہیں کہ ہم وطنیت اور قومیت کو اسلام کے لیے زہر قاتل سمجھتے ہیں، اور مولانا اس کے سرگرم داعی ہیں۔ وہ ہر فکر میں وطن پرستی کا سراغ لگا لیتے ہیں، البتہ انہوں نے گاندھی جی اور کانگریس کی ہندوانہ قومیت سے متعلق بڑی معقول باتیں کہی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب کے سیاست پر بھی دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی ہے۔

> ''مولانا نے فرمایا کہ تعجب ہے مولانا حسین احمد، مصطفیٰ کمال کی ترکی تحریک کے تو خلاف ہیں لیکن حکومت برطانیہ کے عداوت میں اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ گاندھی جی ہندوستانی تحریک چلا رہے ہیں، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی شخصیت کو کس قدر نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔'' (ص: ۳۵۹)

اس تحریک کے ختم کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ مولانا کا ایک وطن پرستانہ ''رجز'' ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر دیا جائے۔ خوبی یہ ہے کہ اس رجز کی تصنیف کا سہرا

بڑے بڑے بزرگوں کے سر باندھا گیا ہے:

''دیوبندی اسکول ہند کو کیا سمجھتا ہے،اس کے لیے''سبحۃ المرجان'' نام کی عربی تاریخ ہند پڑھیئے۔ قدیم مذاہب ہند کے متعلق ان کے نظریات مرزا مظہر جان جاناں اور امام عبدالعزیز دہلوی کے مکتوبات میں ملیں گے... میں ان کی ترجمانی مختصر الفاظ میں یہاں کرتا ہوں۔ ہمارا ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان رفعت کا مالک ہے۔ پہلے دور میں اس نے سنسکرت جیسی زبان پیدا کی۔''کلیلہ و دمنہ'' جیسی حکمت کی کتاب لکھی۔فوجی تمرین کا کھیل شطرنج ایجاد کیا۔ریاضی میں یونان کا ہمسر بنا۔الٰہیات میں ویدانت فلاسفی سکھانے میں''جگت گرو'' بنا۔اس سے ویدک دھرم اور بدھ دھرم دنیا میں پھیلے۔اس نے مہاراجہ اشوک جیسے حکمران پیدا کیے۔دوسرے دور میں قدیم انسانیت کی علمبردار سوسائٹی کو اسلام جیسے انٹرنیشنل پروگرام سے آشنا کرنے والا جلال الدین اکبر پیدا کریا۔مشرقی ایشیاء کی زبانوں کو ملاکر اردو جیسی انٹرنیشنل زبان پیدا کی۔محی الدین عالمگیر جیسا سلطان پیدا کیا جو تمام ممالک ہند کو ایک قانون کا پابند بنا نا سکھا گیا۔امام ولی اللہ جیسا فلاسفر پیدا کیا۔(ص:۹-۳۴۸)

اس''رجز'' کے اور مصرعے جیسے بھی ہوں، مگر اکبر والا مصرعہ تو یقیناً''غیر موزوں'' ہے۔ کہاں مولانا کا چہیتا اکبر اعظم اور کہاں اسلام کی دعوت۔اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے۔

ارادہ ایک مختصر تبصرہ لکھنے کا تھا، مگر کوشش کے باجود یہ تحریر کچھ نہ کچھ طویل ہو ہی گئی، پھر بھی نقد کا حق ادا نہ ہوا۔ضرورت ہے کہ کوئی صاحب نظر عالم پوری کتاب پر بسط وشرح کے ساتھ گہری تنقید کرے۔ راقم نے اپنی بساط کے مطابق صرف نمایاں اور زیادہ قابل اعتراض حصوں کی نشان دہی کر دی ہے۔

☆☆☆

ترانہ جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس

فضا ابن فیضی

سحرکا پیرہن ہیں ہم ، بہار کی ردا ہیں ہم
بدن پہ زندگی کے ، رنگ ونور کی قبا ہیں ہم
چراغ کی طرح ، سرِ دریچۂ وفا ہیں ہم
مغنی حرم ہیں ، بربطِ لب حرا ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

کھلیں گے رمزلوح کے ، کہ اب قلم ہے سامنے
تمام حاصلِ حیات ، بیش وکم ہے سامنے
ہراک طرف سے ، جلوۂ رخِ حرم ہے سامنے
بنارس اب کہاں ، رخِ حرم کا آئینہ ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

اسی کے خوشہ چیں ہیں ہم ، ہماراجامعہ ہے یہ
بلاغت ومعانی و بیاں کا گل کدہ ہے یہ
عرب کے طرزِفکر سے ، عجم کا رابطہ ہے یہ
اسی کے لمس جاوداں سے ، روحِ ارتقاء ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

نگاہ میں ہے عہد رفتہ ، اب بھی حال کی طرح
سلف کا شیوہ سامنے ہے ، اک مثال کی طرح
صنم کدے میں ہم نے دی ، اذاں بلال کی طرح
نفس ہیں جبرئیل کا ، بلال کی ندا ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

کشود عقیدۂ حیات ، معتبر ہمیں سے ہے
شعور جستجوئے ذات ، معتبر ہمیں سے ہے
تمام علم کائنات ، معتبر ہمیں سے ہے
خلاصہ اصل میں ، کتاب کائنات کا ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

سراغ جادۂ عمل ، حدیث مصطفی ہمیں
اسی کا حرف حرف ہے ، نشاطِ ماجرا ہمیں
نہیں قبول ، اب کوئی پیام دوسرا ہمیں
اداشناس عظمتِ حدیث مصطفی ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

یہ گاہوارہ ، ظاہری وباطنی علوم کا
''مدینۃ السلف'' ہمارے مشرقی علوم کا
یہ ایک تربیت کدہ ہے ''مرکزی علوم'' کا
اسی فضائے دلکشا میں ، آج پَرکُشاں ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

یہ حرف برگزیدہ و شگفتہ ، کس زباں کا ہے
یہ نقش ، کس کی ندرت و لطافت بیاں کا ہے
یہی کلام حق ، وظیفہ قلب و جسم و جاں کا ہے
خدا گواہ، بس اسی کے ذوق آشنا ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

ورق ورق ، بصیرتوں کی روشنی سجائیں گے
حرارتِ یقیں سے ، پھر دلوں کو جگمگائیں گے
نظر کو ''درسِ اسوۂ پیمبری'' سکھائیں گے
نقیبِ فضل و دانش و صداقت و صفا ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

خدا کرے ، فضآ یوں ہی ، یہ خواب جاگتے رہیں
یہ خوشبوئیں جواں رہیں ، گلاب جاگتے رہیں
ہنرورانِ سنت وکتاب جاگتے رہیں
چمن چمن ، بشارتِ نسیم جاں فزاں ہیں ہم
کہ گلشنِ رسول کے ، طیورِ خوشنوا ہیں ہم

☆☆☆

الوداعی نظم

الوداعی نظم برائے فارغین جامعہ سلفیہ بنارس ۱۴۴۰ھ-۲۰۱۹ء

(اسد اللہ ابوطالب امواآوی، کلیۃ الحدیث/ ۳)

گلستاں سے ہو رہے ہیں اب جدا اہل نظر
اشک باری کر رہے ہیں جامعہ کے بام و در
چھوڑ کر جانے کے صدمے سے ہوئے ہیں چشم تر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
ہم ترے داماں سے اب تک ہو رہے تھے فیض یاب
مخزن علم حرا سے کر رہے تھے اکتساب
رک نہیں سکتے ہیں اک پل آگیا وقت سفر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
گلستان علم و فن کو چھوڑ کر جائیں کہاں
درس قرآن و حدیث و فقہ لے پائیں جہاں
اب قدم اٹھتے نہیں ہیں بس یہی سب سوچ کر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

اے اعجازؔ الحق تمہاری تھی صدارت بے مثال
آفتابؔ احمد، اسدؔ کی تھی قیادت بے مثال
عبدؔ اول کی نظامت سے عیاں علمی گہر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

اب نہ سن پائیں گے نظمیں تجھ سے اے کیفیؔ کبھی
اور نسیمؔ احمد کے چہرے پر نہیں کیوں تازگی
دل پہ آری چل رہی ہے کیا سنائیں یہ خبر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

صادقؔ و اشفاقؔ و رحمتؔ اور بھائی مرسلینؔ
اجملؔ و پرویزؔ و خوشبوؔ آج دکھتے ہیں حزیں
اور سلماںؔ جارہے ہیں سب سے رشتہ توڑ کر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

شہسوارانِ صحافت میں ہیں یہ ابن کمالؔ
اور اس میدان میں محبوبؔ بھی ہیں بے مثال
ہم ہیں نازاں کاشفؔ و اعجازؔ کی تحریر پر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

نحو کی باریکیوں میں غرق ہیں عبدالصمدؔ
آصفؔ و انصارؔ و عرفاںؔ کرتے ہیں سب کی مدد
ارشادؔ عالم الحسنؔ کی ہے خطابت پر اثر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

شمسِؔ حق غفرانؔ و عارفؔ اور یہ عبدؔالعلیم
کس قدر ناشاد ہیں فیروزؔ اور عبدالکرؔیم
الوداع کہنے کو ہیں سب اپنے آنسو پونچھ کر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

دیکھیے نوشادؔ اور میزانؔ کی افسردگی
اور منیرؔ، عبدالعزؔیز، احساںؔ کی آنکھوں کی نمی
بادلِ ناخواستہ جاتے ہیں سب کو چھوڑ کر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

کشفؔ و شاکرؔ کے جبیں پر چھائی ہے بے چارگی
حامدؔ و حمادؔ، شمسؔ الدین کی یہ خامشی
ہیں پریشاں ابن عرفاںؔ بھی یہ حالت دیکھ کر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

اب مجاہدؔ بھی چلے توحید کا لے کر علم
شرک اور بدعت کا بھی کرتے چلیں گے سر قلم
ان کے پیچھے ہیں ابوؔحمزہ، نعیمؔ اختر، عمرؔ
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

جعفرؔ و رضوانؔ و اسرؔافیل اور بھائی امامؔ
ہم تمھاری اقتداء میں کر رہے تھے یاں قیام
کیا ہوا چشم زدن میں رو پڑے دیوار و در
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

جامعہ کی یاد تو آئے گی ہم کو صبح و شام
کہہ رہے ہیں یہ فضالہؔ و فضیلؔ و بوالکلامؔ
امتیازؔ، ابن منورؔ اور مفیضؔ، ابن قمرؔ
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
دعوت و تبلیغ کی رہ پر چلے سعد و حسیب
یہ وحید، ابن عطاء، تسلیم عارف اور حبیب
عبدؔرحمن و فریدؔ، عبدؔالحکیم ہیں راہبر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
چاہ کر بھی رک نہیں سکتے ہیں یاں بوؔالخیر آج
یہ نفیسؔ احمد، ریاضؔ الدین اور سلطاںؔ بے تاج
کیوں نہ ہو ارشاد اور مختار کی حالت دگر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
تشنگان علم دیں سیراب ہوں تجھ سے سدا
خوشبوئے علم حرا سے ہو معطر یہ فضا
تجھ پہ پیہم چھائے بادل اور پھر برسے گہر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر
یا الٰہی اس چمن کو شاد رکھ آباد رکھ
آنے والی ہر مصیبت سے سدا آزاد رکھ
یاد رکھ اپنی دعا میں اے اسد شام و سحر
مرکز علم و ہنر، اے مرکز علم و ہنر

☆☆☆

اسمائے فارغین

جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس

(1439-40ھ=2018-19ء)

کلیۃ الحدیث

محمد شمس الحق عبدالرؤف

پتہ: حاجی جھبوٹولہ، گوپال پوردیارہ، آمداباد، کٹیہار، بہار-854112

6307660544/9135778382 shamsulhaque9135@gmail.com

محمد مرسلین محمد جمال

پتہ: کجرابیتونا، قصبہ، پورنیہ، بہار۔854330

7783023978 mursalinmd97@gmail.com

پرویز عالم بن محمد حسین

پتہ: عشری خرد، حسن پورہ، سیوان، بہار۔ 841236

9576837344 parwezsalafi55@gmail.com

اجمل حسین عبدالستار

پتہ: اوچلا، پھنڈارتل، براکی، کٹیہار، بہار۔854104

9525552262/9534081115 mdajmalhussain4786@gmail.com

اسداللہ طالب امواوی

پتہ: اموامدینۃ الشیخ، امواکلاں، شیوہر۔ بہار۔843334

6388280953/ 7065946900 asadullahamwawi1995@gmail.com

نسیم احمد عبدالاحمد خان

پتہ:اکبر پور جمنی،تلولی،بانسی۔سدھارتھ نگر،یوپی۔

09721977381 hafiznaseem28@gmail.com

احسان احمد نذیر احمد

پتہ:سمرا،سمری خان کوٹ،سدھارتھ نگر۔یوپی272192

08176041310 ehsannazeer66@gmail.com

عبدالعلیم محمد بدرالدجی

پتہ: گوپال گنج،پوٹراپاڑا،سوتی،مرشدآباد،مغربی بنگال۔742201

08515825177 abdulalim638816@gmail.com

عبدالعزیز عرفان علی

پتہ:فتح پور،مویا،لالگولہ،مرشدآباد،مغربی بنگال۔742148

08145237083 abdulaziz814523@gmail.com

شمس الدین سان اللہ

پتہ: جوگڑابازار،روپندیہی،لمبنی،نیپال۔

009779811464006/8423339560 shamsuddinsalafi98@gmail.com

ارشاد عالم ابوالحسن

پتہ: کھیتول تیواری،ہلکولی،نوگڑھ۔سدھارتھ نگر۔یوپی۔272204

09919512248 irshadalhasan@gmail.com

عبدالحکیم بن عبدالسلام

پتہ:مسینا،روپندیہی،نیپال،لمبنی۔نیپال

009779806923472/ 7275227646 sahilkhan70620@gmail.com

غفران احمد حضرت علی

پتہ: کونڈراوں، پتھرا، بانسی۔ سدھارتھ نگر، یوپی۔272153

08355994665 ghufransalafi1995@gmail.com

ابوالکلام حبیب اللہ

پتہ: بسکوہر بازار، سدھارتھ نگر۔ یوپی۔272192

8382085289/ 7651801373 abulkalam4934@gmail.com

عبدالعزیز عبدالمعید

پتہ: سبھولی، اسوگوا، بانسی، سدھارتھ نگر۔ یوپی۔272153

08127364825 abdulazizkhan4941@gmail.com

میزان الرحمن محمد سلیمان

پتہ: بلاک چوک، سیمل باڑی، گاچھپاڑا۔ کشن گنج۔ بہار۔855107

9123480221/ 7292943613 mizanurrahmankhne@gmail.com

عبداللہ عرفان علی

پتہ: کویا کشن پور، بیلوا، پورنیہ، بہار۔854326

7494099470/ 7061729322 abdullahsalafi99470@gmail.com

رحمت اللہ نورالاسلام

پتہ: رام گھاٹ، بیلوری، مفصل (رانی پترا)، پورنیہ، بہار۔854326

9113438805/ 8084036293 rahmatullahnurulislam@gmail.com

خشب الرحمن بن راجا

پتہ: بیر بنا، دیگھل بینک، کشن گنج۔ بہار۔855101

06393834490 khushburrahmankne@gmail.com

حماد منصور عبد الرحمن

پتہ: انبہ نئی بستی، بجرڈیہہ، بنارس۔ یوپی۔221109

07505948912 jamalazam12@gmail.com/ abusumsam@gmail.com

اعجاز الحق انوار الحق

پتہ: پیرا پڑرو پور، بنکے گاؤں، سدھارتھ نگر۔ یوپی۔272152

09792519209 aijazanwarul@gmail.com

فضالہ بن محمد عبد القیوم

پتہ: B16/130A، مالتی باغ، مدن پورہ، بنارس۔ یوپی۔221001

Mob.: 08563086348

عبد الصمد علاء الدین

پتہ: کرتھی ڈیہہ، ککرا پوکھر، ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر۔ یوپی۔272153

09260968774 abdussamadshah5@gmail.com

کلیۃ الشریعۃ

آفتاب احمد شیخ وکیل احمد

پتہ: میگھ پور، پوریوں، جون پور۔ یوپی۔222136

09559949408 aftabahamed14494@gmail.com

حبیب الرحمن احمد مولوی

پتہ: سامرود، سورت، گجرات۔394315

7383155857/ 9904220910 hmolvi738315@gmail.com

محمد سلمان شمس الدین

پتہ: دھنوہا، رام پور، جون پور، یوپی۔222203

9140746865/ 7860723185 salmanmansoori24101994@gmail.com

عبدالعزیز کفایت اللہ کیفی

پتہ: ڈومریا گنج، وارڈ نمبر15، سدھارتھ نگر، یوپی۔272189

07068107488 abdulazizkaifi@gmail.com

محمد مجاہد الاسلام محمد مصطفی

پتہ: اٹوا، حسن گنج، کٹیہار۔ بہار۔854337

07250641979 mdmujahid876544@gmail.com

محمد جعفر شیخ محمد صابر الدین شیخ

پتہ: رہسپور، پاکوڑ، جھارکھنڈ۔816107

8960982829/ 7979725406 mdzafarshaikh316@gmail.com

فضیل احمد ظفر الاسلام

پتہ:A39/62، سریاں، بنارس، یوپی۔221001
09044028535 zafarfozail@gmail.com

ابوحمزہ محمد زبیر

پتہ:A35/111C3، جلالی پورہ، بنارس، یوپی۔221001
08081630465 abuhamza9016@gmail.com

محمد منیر الاسلام محمد یونس

پتہ: سکورنا، کدوا، کٹیہار، بہار۔855113
08090444082/ 07488893657 manirulislam0505@gmail.com

نعیم اختر اظہر علی

پتہ: رکسی، مدھورا، کوڑھا، کٹیہار، بہار۔854107
07667740858/ 09807149858 nayeemakhtar98071@gmail.com

صادق الحق محمد ثناء اللہ

پتہ: رام گھاٹ، رانی پترا، پورنیہ، بہار۔854337
08228832148 sadiqulhaque2148@gmail.com

محمد کشف الرحمن محمد عتیق الرحمن

پتہ: بیجلپورہ، جھاجھا، جموئی، بہار۔811308
07260986154 rahmanvns2016@gmail.com

محمد رضوان علی محمد ایوب علی

پتہ: سکورنا، جھوا، کدوا، کٹیہار، بہار۔855113
09135643334 mdrezwanali910@gmail.com

اشفاق عالم اُستاب الحق

پتہ: ہاشم پور، سیج ٹولہ، براری، کٹیہار، بہار۔854104

08873818778 alamashfaque643@gmail.com

امام الدین محی الدین

پتہ: چین پور، پرسابلہری، سدھارتھ نگر، یوپی۔272202

09792343870 amamuddinkhan4927@gmail.com

محمد عرفان محمد قربان

پتہ: ماتھاسیر، پربت پور، گریڈیہہ، جھارکھنڈ۔815312

08789888043/ 08757204157 irfan1081994@gmail.com

منیر الدین قمر الدین

پتہ: لکھن پور، پربت پور، گریڈیہہ، جھارکھنڈ۔815312

07970999956 manirddin112001@gmail.com

محمد آصف اقبال

پتہ: باڑھ سمیلا، سمیلا لال گنج، کیوٹی، دربھنگہ، بہار۔847141

09883287923 aeqbal1051995@gmail.com

حسیب الرحمن معین الحق

پتہ: لتاہری، کرنکیا، ارریہ، بہار۔854312

09199480633 hasiburrahman9994@gmail.com

محمد عارف محمد ابراہیم

پتہ: مسلم ٹولہ، دیلار پور، کٹیہار، بہار۔854113

07376705615 mohammadarif7376@gmail.com

شاکر حسین معین الحق

پتہ: ہلدی باڑی، کرندیگلی، اتر دیناجپور، مغربی بنگال۔
Mob.: 08176940823

محمد وحید الزماں مجیب الرحمن

پتہ: منیرام پور، منیرام پور، پاکوڑ، جھارکھنڈ۔816107
07979026782/ 07654419124 mdw97048@gmail.com

محمد انصار امام الحق

پتہ: گارڈٹولہ، آمداباد، کٹیہار، بہار۔854113
08707836987/ 07281987383 ansarmd7383@gmail.com

محمد نوشاد عبد العزیز

پتہ: برہی نوادہ، پوسٹ نوادہ، ضلع وارانسی، یوپی۔221207
09616272858 mrnaushad1997@gmail.com

محمد مفیض الحق عبد الرحمن

پتہ: جے نگر منشاہی، کٹیہار، بہار۔854103
09708380999/ 08756689914 mofizulhaque3@gmail.com

محمد اسرافیل انیس الرحمن

پتہ: نوادا، منیرام پور، پاکوڑ، جھارکھنڈ۔816107
07903225448/ 07764856660 mdisrafilangel@gmail.com

کلیۃ الدعوۃ واصول الدین

ابوالخیر عبدالخالق

پتہ: گواگاچی، مسلم ٹولہ، کانٹا کوٹن، کٹیہار، بہار۔854113

09572114772/ 8873001427 abulkhair10101993@gmail.com

اعجاز انور نوشاد انور

پتہ: کنجاواں، بہٹا، پٹنہ، بہار۔801103

Mob.: 07352039664/ 08789702136

سعد بکر ابوبکر مسلمان

پتہ: بھلمی 2، کپلوستو، لمبنی، نیپال۔

08318836592 saadbakr723@gmail.com

محمد حسیب اللہ نوشاد علی

پتہ: صاحب نگر (بیسا گھاٹ) منساہی، کٹیہار، بہار۔854103

9771112599/ 8920061812 haseebullahsahebnagar9771@gmail.com

محمد فیروز محمد مصطفی

پتہ: چکدلدلہ، بھلجھریا، اہلیاپور، گریڈیہہ، جھارکھنڈ۔815312

Mob.: 09162765563

محمد حامد عبدالمتین

پتہ: بھیکم پور، کٹرا، شنکر نگر، بلرامپور، یوپی۔271201

08840703963/ 07607084074 iamhamidansari2@gmail.com

ریاض الدین اسلام الدین

پتہ: دھجا گھاٹ، دیگھری، روتارا، کٹیہار، بہار۔854106
09534785574 riazuddinsalafi0@gmail.com

نفیس احمد بن محمد مستقیم

پتہ: بان کوئیاں، ککراپوکھر، سدھارتھ نگر، یوپی۔272153
07565959168 nafeessalafi2@gmail.com

شہاب الدین کمال الدین

پتہ: کولہوئی، سنکھر، سدھارتھ نگر، یوپی۔272153
8928984123/ 8052507238 shahabuddinsalafi9@gmail.com

عبدالکریم احمد حسین

پتہ: بھوتہیاں، ہلکولی جوگیا ادے پور، سدھارتھ نگر، یوپی۔272204
8318546934/ 9554720922 kareemsalafi955472@gmail.com

محبوب عالم عبدالسلام

پتہ: انتری بازار، شہرت گڑھ، سدھارتھ نگر، یوپی۔272205
6393225101/ 7705929791 mahboobalam770592@gmail.com

کاشف جمال عبدالرحمان

پتہ: بلاقی پور، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔275101
Mob.: 08887990327/ 09208153317

فیاض احمد منور حسین

پتہ: گھروار، بڑھنی، سدھارتھ نگر، یوپی۔272201
08382055982 fa3838025@gmail.com

تسلیم عارف عبدالرزاق

پتہ: رام گھاٹ، بیلوری، مفصل (رانی بترا)، پورنیہ، بہار۔854326
07562913838 taslimsalafi75@gmail.com

شہاب الدین عطاء اللہ

پتہ: چنگائنڈیہہ، دھوبنا، جامتاڑا، جھارکھنڈ۔815351
09110017164 ansarishahab1997@gmail.com

عمر فاروق معین الحق

پتہ: نکی پورتین گھریا، بجنا تھپور، سیموریا، کٹیہار، بہار۔854106
7808755978/ 9110119901 umarfarooquesalafi@gmail.com

امتیاز عالم ہمایوں شیخ

پتہ: چھوٹا چاند پور، آگلوئی برہروا، صاحب گنج، جھارکھنڈ۔816101
08789625233 imteazalam1000@gmail.com

سلطان احمد مختار حسین

پتہ: لوہاگاڑا، کوڑوباڑی، کشن گنج، بہار۔855101
07667684438 sultanahmadkne@gmail.com

محمد مختار احمد محمد شاہ عالم انصاری

پتہ: تلبڑیا، برہیٹ، صاحب گنج، جھارکھنڈ۔816102
08002393562 mukhtartalbariya@gmail.com

عبدالاول محمد عرفان

پتہ: اوسان کوئیاں، اجگرا، سدھارتھ نگر، یوپی۔272153
09565916539 abdulauvvalkhan2@gmail.com

محمد فرید جلال الدین

پتہ: نارو ڈیہہ، جامتاڑا، جھارکھنڈ۔

06200025546 mdfarid1277@gmail.com

ابوالکلام ابوبکر انصاری

پتہ: بڑا اشر یپور، بوآرئ جور، گڈا، جھارکھنڈ۔813208

08318736183 abulkalam06586@gmail.com

عبدالرحمن عبدالرزاق

پتہ: اترنو داپرہ، آم چترا، سپرا، راج شلین، بنگلہ دیش۔

01776393285/ 01717088967 abdurrahman1996yusuf@gmail.com

ارشاد احمد رجب علی

پتہ: جلال پور، بھدوہی۔ یوپی۔

Mob.: 06388663946